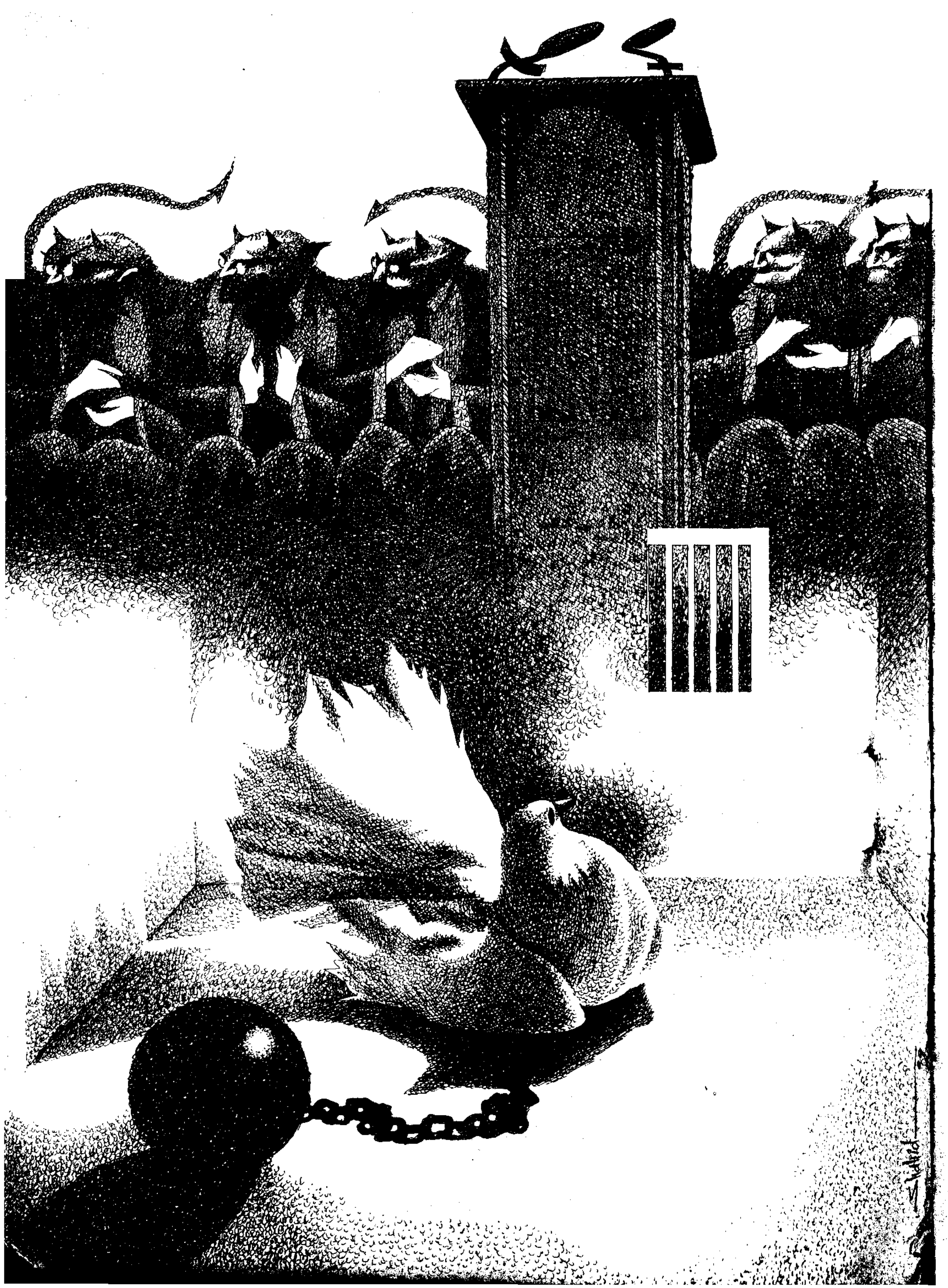


Faisal Ahmed

شمارۂ خاص کی کہانی جس پر مصنف کو دس ہزار روپے انعام دیا گیا

چور دروازے کی سیاست کو ختم کرنے کی جانب مثبت سوچ اور تعمیری جذبے کی بنیادوں پر استوار ایک منفرد اور فکر انگیز تحریر

چور دروازہ

احمد اقبال

ہماری مختصر قومی تاریخ کا ایک دلچسپ اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہاں مختلف حیلوں حوالوں سے مختلف نوعیت کے سیاسی نظام آزمانے کے لیے عوام کے شعور کو بطور تجربہ گاہ کے استعمال کیا گیا۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ جمہوریت تو صرف جمہوریت ہوتی ہے۔ جیسے سورج یا ہوا کے اجزائے ترکیبی پر نہ اسلامی ہونے کا لیبل لگایا جا سکتا ہے اور نہ مغربی ہونے کا الزام۔ نخلِ جمہوریت کو فطری ماحول میں پروان چڑھنے دیا جاتا تو آج ہماری سیاست کا وہ نقشہ نہ ہوتا جو خاص نمبر کے لیے بطورِ خاص منتخب کی جانے والی اس کہانی میں نظر آتا ہے۔
آج ہر باشعور اور مخلص پاکستانی کے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہ مقاصد کیوں فراموش کر دیے گئے جو اس مملکتِ خداداد کی تشکیل کے وقت ہمارے سامنے تھے۔ ہمارے قول و فعل میں یہ تضادات کہاں سے آئے۔ ہماری فکر و نظر میں یہ انتشار کیوں ہے۔ ہم جذباتی منافقت اور معاشرتی تعصب میں کیسے گرفتار ہوئے اور یہ کیسی آزادی ہے جس میں آج ہم سیاسی و معاشی طور پر پہلے سے زیادہ محکوم اور مجبور و حقیر ہیں۔
اس کہانی میں آپ کو کچھ سوالوں کے جواب بھی ملیں گے اور کہانی کا اختتام آپ کے ذہن میں بہت سے غور طلب سوالات کو بھی جنم دے گا۔ ہماری گزارش ہے کہ آپ اسے صرف کہانی سمجھ کے پڑھیں۔ یہ کسی بھی دَورِ حکومت، کسی سیاسی نظریے اور کسی فرد یا جماعت کے خلاف فردِ جرم نہیں ہے لیکن اس تحریر میں آپ کو مُلک و قوم کے مسائل کی تصویر نظر آجائے تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مصنف کی محنت اور ہمارے انتخاب کے ساتھ آپ نے ایک باشعور قاری کی حیثیت سے پورا انصاف کیا۔

خاردار تاروں کی باڑھ والی بلند فصیل کے اندر مجرموں کی بستی میں بھی رات اتر آئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے آس پاس میلوں تک پھیلے ہوئے لاکھوں امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والے سند یافتہ شریف انسانوں کے شہر میں۔

فرق صرف یہ تھا کہ باہر کی دنیا میں رات اپنے ساتھ روشنی لائی تھی۔ مسرّت سے معمور لمحوں کی روشنی، پُرامید خیالوں کی روشنی، دھنک رنگ جگمگ کرتے خوابوں کی روشنی اور وہ روشنی جو کسی کی آنکھوں میں محبّت کے اقرار کی کرن بن کے جھلملاتی ہے تو دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں۔

جیل کی مجرم بستی میں رات کے ہمرکاب ویران اندھیرا تھا۔ بے بسی و تنہائی کا احساس تھا۔ پُرآسیب سنّاٹا تھا اور پُرآشوب سکوت تھا جو احساس پر بھاری پتھر کی چٹان بن کے پڑا رہتا تھا۔ خاموشی کسی آہنی سلاخوں والے دروازے کے بند ہونے سے آخری بار منتشر ہوئی۔ دور اُترا کسی تالے کے جگر میں خنجر۔ کہیں مچلی کوئی زنجیر مچل کر روئی۔ دن بھر کے تھکے ہارے فرشِ خاک پر دراز ہوگئے۔ بیرکوں کوٹھڑیوں اور برآمدوں میں رات کے پہریداروں کی آوازیں بھی خاموش ہوگئیں۔ نمبر ا کالو نمبر ۱؟ حاضر جناب — بالو ۔۔۔ سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے! جیل کا گجر بجا۔

کھولی نمبر سترہ میں دو قیدی تھے۔ سابق پروفیسر صداقت یار خاں۔ ایم اے سیاسیات گولڈ میڈلسٹ۔ ایم اے عمرانیات سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس۔ فی زمانہ قیدی نمبر چار سو نو۔ ان پر اقدامِ قتل، بلوہ اور آتش زنی کے الزامات ثابت ہو چکے تھے اور چونکہ انھوں نے اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے ان کو سنائی جانے والی مجموعی سات سال کی قید بامشقت شروع ہو چکی تھی۔ منافرت و بغاوت پھیلانے ممنوعہ بور کا اسلحہ رکھنے اور اعانتِ مجرمانہ کے علاوہ بھی ان پر کچھ الزامات تھے۔ مثلاً ایک بھینس کی چوری، ایک تھانیدار کی لوٹپی کا سرقہ وغیرہ۔ اگر ان پر مزید سات سال قید بامشقت

کی سزا نہ ہوتی تو حسبِ ضرورت الزامات کی فہرست بڑھائی جا سکتی تھی۔

دوسرا قیدی مشہور ڈاکو نادر شاہ ملنگی تھا جس کو خود بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے درحقیقت کتنے ڈاکے ڈالے تھے اور پولیس نے کتنے بتائے تھے۔ کتنے قتل کیے تھے اور پولیس نے کتنے کر دیے تھے۔ کہاں کہاں اس کے خلاف کتنے پرچے کاٹے گئے تھے اور نہ کیوں کاٹے گئے تھے یہ شاید خود پولیس بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ ہر جرم میں جو اس پر ثابت ہو چکا تھا' اسے کم سے کم موت کی سزا ہو سکتی تھی لیکن ابھی سب مقدمات سماعت کے یا تفتیش کے ابتدائی مراحل میں تھے۔

وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ پروفیسر صداقت اور ڈاکو نادر شاہ کے درمیان کوئی قدرِ مشترک تھی تو چھ ماہ کی یہ رفاقت جس میں وہ دونوں سینٹرل جیل کی سی کلاس میں رہے تھے اور تقریباً تین مہینے سے کھولی نمبر سترہ میں ایک ساتھ تھے۔ ظاہر ہے ان کے خیال و مزاج میں ہم آہنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور ان کے افکار و نظریات کے دھارے متضاد سمتوں میں بہتے تھے۔

"سر جی!" نادر شاہ نے کہا۔

"کیا بات ہے؟" پروفیسر صداقت نے چونک کر کہا۔

"چائے بنا دوں آپ کے لیے؟"

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں نادر شاہ! دل نہیں چاہتا۔"

"پی لیں سر! روز اس ٹیم چائے پیتے ہیں آپ۔" نادر شاہ نے ٹیپ ریکارڈر بند کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بلڈ پریشر کی گولی کھا لی آپ نے؟"

"وہ... نہیں... کل ختم ہو گئی تھیں گولیاں۔"

"پھر آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا سر؟" نادر شاہ نے پلگ میں الیکٹرک کیٹل کا تار لگاتے ہوئے کہا۔

"اب چھوڑو۔ یہ گولیوں سے ٹھیک ہونے والا مرض تو ہے نہیں۔" پروفیسر نے کہا۔ "اور اب تک تمھاری وجہ سے یہ گولیاں مل جاتی تھیں۔ کل کیا ہوگا؟"

"آپ کو بولا ہے میں نے کہ سب ایسے ہی رہے گا۔ آج ہی میں نے کہا تھا کہ میٹھی گولیاں ختم ہو رہی ہیں۔ دیکھ لو شام سے پہلے دو پیکٹ آ گئے۔" نادر شاہ نے کہا۔

پروفیسر صداقت بیک وقت ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس میں مبتلا تھا چنانچہ وہ نمک نہیں کھا سکتا تھا اور چینی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سی کلاس کا قیدی تھا۔ جیل مینویل کے ضوابط کی رُو سے بھی شاید اسے پرہیزی غذا فراہم نہیں کی جا سکتی تھی لیکن ڈاکو نادر شاہ کے حسنِ انتظام نے یہ ممکن بنا دیا تھا کہ پروفیسر کے لیے باہر سے "اسپیشل" کھانا آتا تھا۔ اسے چینی کی جگہ استعمال ہونے والی گولیوں کے علاوہ بھی بہت سی گولیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ بلڈ پریشر کم رکھنے والی گولیاں۔ سکون آور گولیاں۔ ڈاکو نادر شاہ نے ایک دن ہنس کے کہا تھا "سر۔ یہ کیا گولیاں ہیں۔ آپ حکم کرو تو ہم وہ گولی حاضر کر دیں گے' بائیس نمبر یا اڑتیس نمبر یا کوئی سُرور والی گولی کی بات کرو۔"

ڈاکو نادر شاہ کی رفاقت نے پروفیسر صداقت کے لیے روز و شب کی ذہنی و جسمانی اذیت کو برداشت کرنا کچھ آسان کر دیا تھا۔ گزشتہ تین مہینوں میں انھوں نے ایک دوسرے سے بہت باتیں کی تھیں اور اپنے درمیان اعتماد کی فضا کو اس حد تک استوار کر لیا تھا کہ اب وہ ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ وہ بھی جو سچ تھا۔ وہ بھی جو سچ بن گیا تھا یا بنا دیا گیا تھا اور وہ بھی جو کوئی جانتا نہیں تھا یا مانتا نہیں تھا۔

ڈاکو نادر شاہ کے لیے کسی بھی زنداں کی خلوت میں اپنی انجمن سجا لینا بہت آسان تھا۔ وہ کہتا تھا "یہ تو اپنے لیے ایک ریسٹ ہاؤس ہے سر۔ جب بہت تھک جاتے ہیں تو کچھ دن آرام کرنے کے لیے یہاں آ جاتے ہیں۔" اور یہ بات غلط نہیں تھی۔ ڈاکو نادر شاہ کو جیل کے اندر وی آئی پی کا درجہ حاصل تھا چونکہ پروفیسر صداقت یا کسی زمانے میں اس کا استاد رہا تھا اور ڈاکو نادر شاہ اسے سب کے سامنے احترام سے سر کہتا تھا چنانچہ اسے بھی اپنے شاگردِ رشید کے طفیل خود بخود وی آئی پی تسلیم کر لیا گیا تھا۔

جو سہولیات اسے نادر شاہ کی وجہ سے جیل کے اندر حاصل ہو گئی تھیں' وہ خود پروفیسر کے لیے زیادہ اہم نہ تھیں۔ وہ چائے سگریٹ پیے بغیر رہ سکتا تھا۔ اخبار اور ریڈیو کے بغیر گزارہ کر سکتا تھا۔ جیل کے عام قیدیوں کے ساتھ بیٹھ کے کھا سکتا تھا۔ وہ جیل کے حکام سے کسی شائستہ رویّے کی توقع لے کر بھی نہیں آیا تھا۔ چنانچہ گالی گلوچ سے مار پیٹ تک سب برداشت کر سکتا تھا اور اسیری کے پہلے تین ماہ میں اس نے ہر آزمائش کو صبر کے ساتھ اس لیے قبول کیا تھا کہ یہ راہ بھی اس نے اپنے لیے اپنی مرضی سے منتخب کی تھی اور اسے علم تھا کہ اس کا سفر کتنا دشوار ہوگا لیکن بعد میں اس کا خاندان مالی مشکلات' معاشرتی مسائل اور عدم تحفظ کے مصائب کا شکار ہوا تو آزارِ تنہائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کا دکھ بھی اس کے جذبۂ استقامت کو کمزور کرنے لگا جو صرف اس کی وجہ سے سختیٔ ایّام کو جھیلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اپنی خود غرضانہ سوچ پر پشیمانی اور تاسف کے جذبات نے اس کا ذہنی سکون چھین لیا۔

شاہینہ نے دو مہینے تک اسے کچھ خبر نہ ہونے دی

تھی حالانکہ وہ جب بھی ملاقات کے لیے آتی تھی تو اس کے لیے اندر کے دکھ پر لبوں کی جھوٹی مسکراہٹ اور اطمینان کے ظاہری انداز کا پردہ ڈالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

بالآخر ایک دن اس نے کہا۔ "شانی! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرو۔"

شاہینہ کے آنسو چھلک پڑے۔ "کیا فائدہ ہوگا اس سے؟ تم کیا کرو گے یہ جان کر کہ گڈّو کو اسکول سے نکال دیا گیا ہے۔ اسے اب کسی اسکول میں داخل کرانا بھی ممکن نہیں رہا۔ فارم بھرتے وقت میں ولدیت کا خانہ خالی تو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"فکر کی کیا بات ہے اس میں۔ تم خود پڑھا سکتی ہو گڈّو کو۔ یہ زیادہ دن کی بات نہیں ہے شانی۔ ہم اسے پھر پبلک اسکول میں پڑھائیں گے اور وہی لوگ جو آج میرا نام ولدیت کے خانے میں دیکھ کر اسے داخلہ نہیں دیتے کل اس بات پر فخر کریں گے..."

"مجھے بتاؤ آج کا دن میں کیسے گزاروں صداقت۔" شاہینہ سلاخوں پر سر رکھ کے رونے لگی۔ "میں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔ چار جگہ ملازمت کے لیے کوشش کی۔ ہر جگہ تمھاری نیک نامی کے قصّے مجھ سے پہلے پہنچ گئے۔ میں نے مکان کا آدھا حصّہ کرائے پر اٹھانے کے لیے اشتہار دیا۔ آنے والوں کو باہر سے ہی لوٹا دیا گیا۔ سادے کپڑوں میں وہ لوگ دن بھر گلی میں موجود رہے۔ خود گلی محلّے والوں نے ہم سے ملنا چھوڑ دیا ہے اور وہ جو تمھارے دوست اور ساتھی تھے۔ تمھارے ہم خیال لوگ۔ ان میں سے بھی کوئی نظر نہیں آتا اب۔ ظاہری رواداری اور رسمی تعلّق رکھتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں لوگ۔ ہمارا فون کٹ گیا ہے۔ ایک دن بجلی بھی کاٹ دی جائے گی..."

مایوس و دل گرفتہ پروفیسر صداقت یا رنے کئی نام لیے۔ فلاں نے کچھ نہیں کیا! اور وہ بھی نہیں آیا! یہ مقامی سیاسی لیڈر تھے جو اس کی دانشوری پر اپنی دکان چلاتے تھے۔ وزارت کے متوقع امیدوار تھے جو اس کے خیالات سے اپنی تقریریں سجاتے تھے۔ وہ سب اسے بھول گئے تھے۔ اس نے سب کو گالیاں دیں۔ بزدل اور بے ضمیر کہا لیکن شاہینہ کے آنسو نہ پونچھ سکا اور جب واپس لوٹا تو اپنے ظلم کے احساس نے اس کو رات بھر سونے نہ دیا۔

اس نے اپنا دکھ ڈاکو نادر شاہ ملنگی سے چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کے ذہین شاگرد نے خود ہی سب سمجھ لیا اور اپنے الفاظ میں کہہ دیا۔

"سر جی! ہم سے کیا چھپاتے ہیں۔ ہم نے تو یہ پہلے بھی دیکھا ہے۔ آپ کو سیاست میں پڑنے سے پہلے دیکھنا تھا کہ گھر میں

کھانے کے لیے دانے ہیں یا نہیں۔ اور بیوی بچّوں کے والی وارث ان کی حفاظت کر سکتے ہیں یا بس خدا پر ہی تکیہ ہے۔ اب چھوڑیں فکر کرنے سے کیا ہوگا۔ بندہ خود نہ کرے تو خدا کیا کرے۔"

نادر شاہ کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے جیل کے باہر کی دنیا بھی اپنی دسترس میں تھی۔ نہ جانے اس نے کس سے کیا کہا۔ مگر اگلے ہفتے جب شاہینہ پھر آئی۔ تو اس کا پُر امید چہرہ روشن تھا۔

"چلو' خدا نے کسی کے دل میں تو نیکی ڈالی۔ اب کم سے کم سال تو گزار ہی لوں گی میں' جیسے تیسے کر کے۔"

"سال گزار لو گی؟"

"وہ... میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم خدانخواستہ سال بھر قید میں رہو گے۔" شاہینہ نے گھبرا کے کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ فی الحال بیس ہزار کا آسرا ابھی بہت ہے۔"

"بیس ہزار! کہاں سے آئے بیس ہزار؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"تمھارے کالج سے۔ تمھارے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ہے۔"

"شانی! تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" پروفیسر صداقت نے بگڑ کے کہا۔ "کالج والے دیں گے مجھے پراویڈنٹ

فنڈ میں سے رقم؟ وہ بھی میرے مانگے بغیر کسی درخواست کے بغیر۔ جب کہ میں جیل میں ہوں۔ واجبات تک تو روک لیے گئے تھے میرے۔ چھ مہینے تک مجھے تنخواہ نہیں ملی تھی۔"

شاہینہ ڈر گئی "مجھے... یہی کہا تھا اس نے۔"

"کس نے؟ کون تھا وہ؟ نام پوچھنا تھا اس کا۔" پروفیسر صداقت نے چلّاتے ہوئے کہا "وہ آیا تھا مجھے خریدنے یا تمھیں خریدنے۔ تم نے اسے غیبی امداد سمجھ کے قبول کر لیا۔"

"ہو سکتا ہے، تمھارے کسی ساتھی نے مدد کی ہو جو سامنے آنے سے ڈرتا ہو۔" شاہینہ نے کہا۔ "اب میں اس رقم کو باہر تو پھینکنے سے رہی۔"

یہ خیال اسے واپس اپنی کھولی میں پہنچ کے بہت دیر بعد آیا کہ کہیں یہ نادر شاہ کی کارستانی نہ ہو۔ اس کی خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔ خلافِ معمول اس نے پروفیسر سے پریشانی اور برہمی کا سبب تک نہیں پوچھا تھا۔

"نادر! دیکھو جھوٹ مت بولنا۔ تم نے میرے گھر بیس ہزار روپے پہنچائے ہیں۔" اس نے اچانک کہا۔

"بیس ہزار؟" نادر شاہ نے بے حد حیرانی کا اظہار کیا۔ "سر جی! اپنے پاس تو یہ بیس روپے ہیں جیب میں۔"

پروفیسر بہت بگڑا مگر نادر شاہ معصوم بنا رہا اور اس معاملے سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کرتا رہا۔ ایک سعادت مند شاگرد کی طرح اس نے پروفیسر کی سب باتیں سن لیں اور سر جھکا کے جھاڑ کھالی مگر پروفیسر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اگلے ہفتے ملاقات پر شاہینہ نے اسے اطلاع دی کہ وہ خبر غلط نہیں تھی۔

"کون سی خبر؟"

"جس پر تم اتنا چلّا رہے تھے۔" شاہینہ نے کہا۔ "میں خود تمھارے کالج گئی تھی اور کیشیئر سے ملی تھی۔ اس کے بعد پرنسپل سے ملی تھی۔ انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ رقم تمھارے پراویڈنٹ فنڈ میں سے ادا کی گئی تھی لیکن یہ بھی کہا کہ میں اس کا تذکرہ کسی سے نہ کروں ورنہ وہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

پروفیسر صداقت نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "شانی! مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنا پڑھ لکھ کے بھی تم اتنی نادان رہو گی۔ ارے بابا وہ رقم بھجوائی تھی نادر شاہ ڈاکو نے۔ میرا ایک شاگرد تھا کبھی وہ۔"

"پھر کالج والوں نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ..."

"شانی! انھیں نادر شاہی فرمان یہاں سے جاری ہوا ہو گا۔ اگر وہ تم سے ایسا نہ کہتے تو واقعی مشکل میں پڑ جاتے۔ میں کیا کروں۔ مجھ پر ایک ڈاکو کے احسانات کا بار بڑھتا جا رہا ہے۔ کتنی شرم کی بات ہے۔"

"چائے ٹھنڈی ہو جائے گی سر۔" نادر شاہ نے کہا۔

پروفیسر پھر چونکا "ہاں! تھینک یو نادر، تمھاری یہ خدمت گزاری مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ جو کچھ تم نے کیا۔ اس کے بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے تم پر فخر ہے۔"

"ایک ڈاکو اور قاتل پر۔" نادر ہنسنے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر!"

"سزا اور جزا کو الگ الگ رکھنا چاہیے نادر۔" پروفیسر صداقت نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "اگر میں عدالتِ انصاف میں جج کی کرسی پر بیٹھا ہوتا تو میں کہتا کہ ازروئے قانون تو ڈاکو نادر شاہ مجرم ہے اور اسے پھانسی ہونی چاہیے۔ مگر اس کی فطری شرافت کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو قابلِ تعریف ہی نہیں قابلِ تقلید ہیں، ان کے لیے جو دوسروں کو درسِ انسانیت دیتے پھرتے ہیں مگر خود انسان نہیں۔ اب سو فیصد انسان تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے کبھی کسی کو سو میں سے سو نمبر نہیں دیے۔ نہ عمرانیات میں اور نہ سیاسیات میں۔ لیکن آدمی چاہے تو چالیس فیصد انسان ہو سکتا ہے یا ساٹھ فیصد اور ستّر فیصد۔ اب تم اپنی مثال لو۔ تم ساٹھ فیصد ڈاکو اور قاتل ہو لیکن چالیس فیصد انسان ضرور ہو۔"

"آپ کی باتیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں سر۔ میں ایک نالائق شاگرد تھا۔ صرف حساب میں اچھے نمبر لیتا تھا۔ وہی حساب میرے کام آیا۔ میں نے نفع نقصان دیکھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔" نادر شاہ نے کہا۔

"کون سی ترازو سے تول کے یہ بات کہہ رہے ہو؟"

"اسی ترازو سے سر جو دنیا کے ہاتھ میں ہے۔ پلڑا اسی کا بھاری ہے جس کے پاس دولت ہے۔ دولت سے طاقت بھی آتی ہے، عزت اور شہرت بھی۔"

پروفیسر صداقت نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

"مجھے معلوم ہے سر۔" نادر شاہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کہ آپ میری بات سے کبھی اتفاق نہیں کریں گے۔ آپ کے نزدیک میں نے خسارے کا سودا کیا۔ آخرت گنوائی اور دنیا میں کوئی عزت نہیں کمائی۔ آپ یہ بھی نہیں مانیں گے کہ اس جیل کے اندر آپ کی جتنی عزت ہے، وہ ڈاکو نادر شاہ کی وجہ سے ہے — آپ کے علم اور آپ کی ڈگریوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ بے شک، یہ سب اصولاً بہت غلط ہے لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ جو ہے، سو ہے۔"

"تمھارا قصور ہے نادر شاہ۔ تم نے دولت کو مقصد اور منزل بنا لیا۔ تم نے دولت کو اہمیت عطا کی۔ پھر اس کام میں وہ سب تمھارے ساتھ شامل ہو گئے جو ڈاکو نہیں کہلاتے اور اختیارات کے ساتھ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ سرِ عام۔ دن دہاڑے بے خوفی کے ساتھ۔ راشی افسر، اسمگلر، ضمیر فروش سیاستداں۔ انھوں نے علم کو بے وقعت کر دیا۔ ان کی لمبی لمبی کاروں کے سامنے لمبی لمبی کاغذی ڈگریاں بے عزت ہوئیں۔ یہ سب کچھ کرنے والے اکیلے تم نہیں ہو۔ مگر خود کو بے قصور تو مت کہو۔"

"اچھا سر۔ میں بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ مجھے تین مہینوں میں قائل نہ کر سکے۔ میں لاجواب ضرور ہوا لیکن اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی تھی۔ آپ سب کچھ دیکھتے رہے مگر آپ پھر بھی اپنی خیالی دنیا سے باہر آنے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

"بحث سے کون قائل ہوتا ہے نادر شاہ۔ اگر کوّا کہنے لگے کہ کالا رنگ اچھا ہوتا ہے۔ تو کالا ہو جا۔ اور بگلا جواب دے کہ نہیں، سفید رنگ اچھا ہے، تو سفید ہو جا۔ تو کیا انھیں اس بحث سے کچھ حاصل ہو گا؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"اسی لیے تو میں لمبی بات کرنا نہیں چاہتا۔ اب وقت بھی نہیں رہا۔ مجھے بتائیں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "فیصلہ تو میرا وہی ہے نادر۔ فیصلہ بدل کیسے سکتا ہے۔ تم جاؤ۔"

"آپ نہیں جائیں گے میرے ساتھ؟"

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے نادر، یہ میں جانتا ہوں اور یقیناً خدا بھی جانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں کسی بھی عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں ناکام رہا اور میرے خلاف الزامات عائد کرنے والوں نے جھوٹے گواہ اور جھوٹی شہادتیں پیش کر کے مجھے مجرم بنا دیا۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج بہت مجبور ہوتا ہے۔ وہ محض اپنے یقین کی بنا پر کسی گواہ کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا اور کسی شہادت کو مسترد نہیں کر سکتا۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی سزا سناتا لیکن جو بات میرے لیے باعثِ اطمینان ہے، وہ میرا یقین ہے۔ میں آج بھی اتنا ہی بے گناہ ہوں جتنا الزامات کا یہ سلسلہ شروع ہونے سے پہلے تھا۔ تمھارے ساتھ فرار ہو کے میں اپنا پہلا جرم نہیں کر سکتا۔ اس سے میرا اپنی ذات پر یقین ختم ہو جائے گا۔"

"رہنے دیں سر۔ کیا دیا ہے آپ کو اب تک اس یقین نے؟ دنیا کی نظر میں آپ کیا ہیں، اس پر غور کریں۔ اگر آپ کو اس یقین نے سکون دیا ہوتا تب بھی میں مان لیتا کہ آپ کا یقین کسی اور کے نہ سہی آپ کے کام تو آیا۔ مگر آپ کے یقین کی چٹان میں اسی روز دراڑ پڑ گئی تھی جس روز آپ نے ڈاکو نادر شاہ

پروفیسر صاحب بڑی تیزی سے حاضری لے رہے تھے۔ ہر نام پر "یس سر!" کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اچانک ایک نام پر پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔

"کیا پوری کلاس میں اس لڑکے کا کوئی دوست نہیں ہے؟" پروفیسر نے پوری کلاس کو خاموش دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کے طفیل ملنے والی پہلی رعایت قبول کی تھی۔ کہیے کہ یہ غلط ہے؟ کیا آپ جانتے نہیں کہ کسی بھی قیدی کو یہ مراعات کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات، وزیرِ قانون، سپریم کورٹ کسی کے اختیار میں نہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سب میری دولت اور طاقت کا کرشمہ تھا کہ آپ کو سی کلاس میں اے کلاس کی مراعات ملتی رہیں۔ آپ کے بیوی بچے محفوظ رہے۔ ان کے لیے معاشی مسائل پیدا نہیں ہوئے؟ میری سب دولت ناجائز ذرائع سے حاصل ہوئی تھی۔ میں نے رزقِ حلال سے آپ کی مدد نہیں کی تھی اور آپ نے یہ مدد قبول کی تو کیا یہ جرم نہیں ہوا؟ چوری کا مال لینے والا بھی قانون کی نظر میں مجرم ہوتا ہے اور جب آپ نے وہ مراعات قبول کر لیں جو قانون کی رُو سے آپ کو حاصل نہیں ہو سکتی تھیں تو کیا آپ قانون شکنی کے مرتکب نہیں ہوئے؟ میں نے ہر کام قانون کے خلاف کیا۔ جیل کے اندر میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا، خرید رکھا تھا۔ آپ نے کبھی اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کبھی شکایت کی جیلر سے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا جرم سے چشم پوشی جرم نہیں ہے اور جرم کو چھپانا جرم نہیں ہے؟ اپنا پہلا جرم آپ پہلے کئی بار کر چکے ہیں سر۔ حقیقت کو تسلیم کر لیں سر کہ میرے نام کی دہشت آپ کی ڈگریوں کی عزت سے زیادہ تھی اور رہے۔ سچ بولو، پورا تولو۔ اتفاق میں برکت ہے۔ لالچ بُری بلا ہے۔ یہ سب تو آج وہ بچے بھی نہیں مانتے جو روز اپنی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔"

"آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" پروفیسر صداقت نے بے بسی سے کہا۔

"وہ سب جو میں نے کبھی نہیں کہا۔ چھوڑ دیں اپنی یہ خیال پرستی سر جس کی بنیاد کوئی نہیں۔" نادر شاہ نے کہا۔ "کچھ نہیں ملے گا تم کو اس دنیا کو یہ بتانے سے کہ تم صداقت یار ہو۔ سچائی کے دوست ہو اور سچائی کے علمبردار۔ اس سچائی نے تم کو یہاں تک تو پہنچا دیا ہے۔ یہی سچائی کی راہ تم کو اور آگے

لے جائے گی۔ پھانسی کے تختے تک۔ تم سقراط نہیں ہو اور منصور نہیں ہو جن کا نام کئی بار لے چکے ہو تم۔ تم ایک پروفیسر تھے مگر جب مرو گے تو تم پر چوری، ڈکیتی، قتل، اغوا جیسے الزامات ہوں گے۔ مرنے کے بعد بھی عزت نہیں ملے گی تمھیں سر۔ کوئی تمغا نہیں دے گا تمھیں پس از مرگ۔ تمھاری بیوی بہت خوبصورت ہے اور ابھی صرف دو بچّوں کی ماں ہے۔ کیا کرے گی وہ؟ تمھاری یاد کو سینے سے لگائے بیٹھی رہے گی؟ نہیں پروفیسر صداقت۔ وہ دوسری شادی کرے گی کسی چرم فروش سے یا شکر کے آڑھتی سے۔ یا وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ وہ آزادی سے اپنا کاروبار کرے گی۔ اپنے جسم کا کاروبار۔“

”شٹ اپ“ پروفیسر نے ڈاکو نادر شاہ ملنگی کے گال پر تھپّڑ مار کے کہا۔ ”بند کرو اپنی یہ بکواس۔“

ڈاکو نے اپنا دوسرا گال آگے کر دیا۔ ”میرے مُنہ پر ایک تھپّڑ اور مار دیں سر۔ آج تک میں کبھی آپ کو سچ کے زہر کی کڑواہٹ سے نہیں مار سکا تھا۔ آج آپ نے یہ زہر پی لیا ہے۔ آپ نے مجھے جو سبق پڑھایا تھا۔ وہ میں بھول گیا تھا کیونکہ وہ آؤٹ آف ڈیٹ تھا۔ میں نے اپنے کالج کی ہر ڈگری کو پھاڑ کے پھینک دیا تھا اپنی ماں کی قبر پر۔ لوگ پھول چڑھاتے ہیں، میرے پاس پھول چڑھانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اسے کفن بھی ایک خیراتی ادارے سے ملا تھا۔ میں اپنی ڈگری کے ٹکڑے اس کی قبر پر چڑھا کے وہ سب بھول گیا تھا جو کتابوں میں پڑھا تھا۔ آج میں تمھارا وہ شاگرد نہیں۔ ڈاکو نادر شاہ ملنگی ہوں جس کے نام سے بڑے بڑے کانپتے ہیں۔ کوئی اور مار سکتا تھا میرے مُنہ پر یہ تھپّڑ؟ تم کو یہ اعزاز بھی میں نے ہی دیا۔ تم اب فخر سے ہاتھ بلند کر کے دکھا سکتے ہو کہ دیکھو، یہ ہے وہ ہاتھ جس سے میں نے نادر شاہ ملنگی کے مُنہ پر چانٹا مارا اور لوگ مرعوب ہو جائیں گے لیکن تم ان کو اپنا گولڈ میڈل دکھاؤ۔ وہ کہیں گے کہ ہاں، نام کا گولڈ میڈل ہے، پیتل پر سونے کا پانی ہے۔ کوئی مرعوب نہیں ہو گا اس سے سر۔“

پروفیسر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”خدا کے لیے چپ ہو جاؤ نادر شاہ۔ مجھے اتنا بے وقعت نہ کرو خود میری ہی نظر میں۔ مجھے اپنی زندگی کے فلسفے کے ساتھ مر جانے دو۔ میں اپنے نظریات پر قائم رہنا چاہتا ہوں تاکہ مرتے وقت مجھے پچھتاوا تو نہ ہو کہ میری ہی سوچ غلط تھی۔ مجھے یہ احساس تو نہ ہو کہ ازلی و ابدی سچائی کچھ نہیں ہوتی۔ میں نہیں مان سکتا کہ کل سقراط نے زہر کا پیالہ قبول کر کے بے وقوفی کی تھی اور آج تم میرے مقابلے میں بڑے آدمی ہو کیونکہ تم اپنی منوا سکتے ہو۔“

”پروفیسر صاحب! افسوس تو یہی ہے کہ تم سقراط بھی نہیں بنو گے اور تمھیں پچھتانے کے لیے دوسری زندگی بھی نہیں ملے گی۔ تم حوصلہ ہارنے لگے ہو۔ تم نے اپنے اصول اور نظریات پر اپنا مستقبل قربان کر دیا۔ اپنے بیوی بچّوں کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمھاری اس قربانی کا تمھیں کوئی صلہ ملے گا؟ معاشرہ بدل جائے گا؟ اچانک حق دار کو حق ملنے لگے گا۔ انصاف کا بول بالا ہو گا۔ مظلوم کی سنی جائے گی۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ حاکم و محکوم میں پردے حائل نہیں رہیں گے۔ غربت اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ملنے لگے گی۔ لوگ متقی اور پرہیزگار ہو جائیں گے اور تمام سماجی اور اخلاقی برائیاں ختم ہو جائیں گی؟“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”نہیں سر۔ یہ سب ایسے ہی رہے گا۔ حکومت یا نظام نہیں صرف چہرے پھر بدل جائیں گے۔ شاید چہرے بھی نہ بدلیں، صرف نقاب بدل جائے لیکن آپ کو یقین دلا دیا جائے گا کہ یہ انقلاب ہے۔ وہ انقلاب جس کے لیے آپ جدّوجہد کرتے رہے، نعرے لگاتے رہے۔ آپ جیسے سب ہر بار یہاں نظر آئیں گے۔ جو ہر انقلاب کے نعرے کے پیچھے بھاگنے والے لوگ تھے۔ ان کو بہت دیر سے احساس ہو گا کہ وہ سراب کے پیچھے سرگرداں رہے۔“

”اچانک تم بہت عقلمند ہو گئے ہو نادر۔“ پروفیسر نے طنز سے کہا۔ ”تمھاری باتیں سن کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ تم ڈاکو ہو۔“

”ایک بات کہوں سر۔ اسے آپ خود فریبی کہیں، خوش فہمی یا میرا بہت بڑا بول۔ لیکن میں ایک بات جانتا ہوں۔“ نادر شاہ نے کہا۔ ”اگر میں چاہتا تو مقابلے کا امتحان پاس کر کے کوئی بااختیار سرکاری افسر بن جاتا اور ’ہذا من فضلِ ربّی‘ کے نام پر لاکھوں کروڑوں باہر کے کسی بنک میں رکھتا اور لاکھوں کروڑوں کی جائداد یہاں کھڑی کر لیتا اور میں سیاست میں داخل ہو جاتا تو اسمبلی کا رکن بن جاتا اور پھر وزارت حاصل کر لینا میرے لیے مشکل نہ تھا۔“

”پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟“ پروفیسر تلخی سے ہنسا۔

”مجھے موقع نہیں ملا، سہارا نہیں ملا۔ میں بہترین مقرر تھا اپنے کالج میں۔ یونین کا صدر تھا اور بڑی آتش فشاں انقلابی تقریریں کرتا تھا۔ اسی زمانے میں سیاستدانوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ سب مجھے اپنے اپنے مخالفوں کے خلاف مہرے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس کا معاوضہ بھی بہت مل سکتا تھا۔ کالج سے نکل کے میں لیبر لیڈر بن سکتا تھا اور کسی بھی سیاسی گروہ یا جماعت کے مفادات کی پاسداری کر سکتا تھا۔ مجھے

نی ناموں سے ٹھیکے مل جاتے، امپورٹ لائسنس مل جاتے اور ن ہر دورِ حکومت میں وزیر یا سفیر یا مشیر اور افسر بکارِ خاص ہوتا بن میں نے سوچا کہ راشی افسر ہو اور بدعنوان سیاستداں یا ڈاکو، رق صرف لیبل کا ہے۔ کام تو وہی ایک ہے۔“

”چنانچہ تم ڈاکو بن گئے۔“

”نہیں، اب ایسا بھی نہیں کہ میں نے بہ رضا و رغبت اور قائمیِ ہوش و حواس یہ پیشہ پسند کیا۔“ نادر شاہ بولا۔ ”دراصل ٹرین ہ میں نے مس کر ہی دی تھی۔ جو ہاتھ مجھے آگے بڑھا سکتے تھے نھیں میں نے جھٹک دیا تھا۔ وہ ہاتھ بہت طاقتور تھے۔ بعد ں ان ہاتھوں نے مجھے اصول کی بات اور نظریات کا پرچار کرنے ی سزا دی۔ کالج سے نکلتے ہی مجھے احساس ہوا کہ عملی زندگی میں عرے کام نہیں آتے اور کام آتے ہیں تو وہ نعرے جن میں نافقت بھری ہوتی ہے۔ مجھ کو اچھا اور سچّا کارکن سمجھتے ہوئے لسی نے قبول نہیں کیا۔ میں ان کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ س وقت خون گرم تھا اور جوانی کا جوش غالب تھا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ میں حق و صداقت کے اصولوں پر کاربند رہ کے ان سب کا مقابلہ کر سکتا ہوں جو میری آواز کو دبانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ہار نہیں مانی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مجھ پر روزگار کے اور زندگی کے سب دروازے بند ہو گئے مگر سب ید خانوں کے دروازے کھل گئے۔ مجھ پر مقدمات قائم ہونے لگے بالکل اسی طرح جیسے آپ پر ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے شکست سلیم نہیں کی۔ اپنا راستہ بدل لیا۔ اب میں طاقتور ہوں چنانچہ وہ سب پھر میرے ساتھی ہیں جو طاقتور ہیں۔ طاقتور جب طاقتور کا ساتھ دیتا ہے تو ایک سُپر پاور وجود میں آتی ہے۔ کمزور نہ اتحاد کر سکتے ہیں اور نہ انھیں ہماری سُپر پاور متحد ہونے کی اجازت دیتی ہے۔“

”تمھارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے نادر؟“ پروفیسر صداقت نے بے خیالی میں کہا۔ ”نہ مجھ میں وہ حوصلہ ہے اور نہ میری وہ عمر ہے کہ میں ڈاکو بن سکوں۔“

”آپ کچھ مت کریں سر۔ بس حقیقت پسند ہو جائیں۔ آپ کو خدا نے عقل دی ہے اور یہ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ ان نوّے فیصد جذباتی اور کم عقل لوگوں میں شامل نہیں جن کو دس فیصد ذہین اور عقلمند ایک ریوڑ کی طرح ہانکتے ہیں۔ ان کو سبز باغ دکھا کے کبھی ایک طرف لے جاتے ہیں کبھی دوسری طرف۔ ان کے اشارے پر وہی ہجوم جو زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا، مردہ باد چلّانے لگتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ دنیا میں سب عقل و ذہانت میں برابر ہوتے تو کیا یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ جب

ایک سیاسی رہنما استقبالیہ میں مدعو تھے، ایک مزاحیہ فنکار حاضرین کو لطیفے سنا رہا تھا۔ حاضرین چائے پی رہے تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔
اچانک میزبان نے جھک کر صاحب صدر سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”کیا خیال ہے لوگوں کو کچھ دیر اور لطف اندوز ہونے دیا جائے یا آپ کی تقریر شروع کروائی جائے؟“

تک دنیا میں بے وقوف زندہ ہیں عقلمند بھوکے نہیں مر سکتے۔ خدا نے آپ کو عقل کی لاٹھی دی ہے۔ پھر بھینس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھینس آپ کی ہو سکتی ہے۔“

”تم ..... بہت خطرناک آدمی ہو نادر شاہ۔ بے ضمیر سیاستدانوں سے بھی زیادہ۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے یہ بات جیلر کو بتا دینی چاہیے کہ تم آج رات فرار ہونے والے ہو۔“

نادر شاہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”جیلر کو؟ اب بتاؤ گے آپ؟ اسے بہت پہلے سے معلوم ہے سر۔“

”جیلر کو معلوم ہے! اور ... وہ کچھ نہیں کرے گا؟“

”نہیں سر۔ اسے کیا ضرورت ہے۔“

”کیونکہ یہ اس کا فرض ہے۔“

”فرض کی قیمت کتنی ہے؟ اس کی تنخواہ کے برابر۔ اور تنخواہ کتنی ہے اس کی؟“ نادر شاہ نے کہا۔ ”اس حقیر رقم کے لیے وہ اپنی جان دے دے؟ یہ توقع کیوں رکھتے ہیں اس سے آپ؟“

”کیا اس کے خلاف انضباطی کارروائی نہیں ہو گی، فرض سے غفلت برتنے کے جرم میں؟“ پروفیسر نے کہا۔

”ضرور ہو گی۔ اسے معطل کر دیا جائے گا اور یہ خبر بہت نمایاں طور پر اخبار میں شائع ہو گی۔“ نادر شاہ ملنگی نے کہا۔ ”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کل وہ میرے بھائی کی خدمت میں حاضر ہو کے سلام کرے گا اور اسے اتنی رقم انعام میں مل جائے گی جو اس کی تین سال کی مجموعی تنخواہ سے بھی زیادہ ہو گی۔ میرا بڑا بھائی بھی ڈاکو ہے اور ہم ایک بہت بااثر سیاسی خاندان سے وابستہ ہیں۔ ہمارے دم سے ان کی دہشت قائم رہتی ہے اور ان کا اثر رسوخ ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔ جیلر کچھ عرصے بعد بحال ہو جائے گا اور اسے اپنی مرضی کی جیل میں بھیج دیا جائے گا مگر یہ خبر کسی اخبار میں شائع نہیں ہو گی۔ خبروں کے معاملے میں لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ وہ پرانی خبریں بھول جاتے ہیں اور نئی سنسنی خیز خبریں انھیں فراہم بھی اس لیے کی جاتی ہیں کہ وہ

پرانی باتیں نہ کریں ۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم پکڑے کیوں گئے تھے ؟"

نادر شاہ ملنگی ہنسنے لگا۔"آخر پولیس کو بھی تو پبلک کے سامنے اپنی کارکردگی کا ڈراما کرنا ہی پڑتا ہے سر۔اس الزام کو بھی غلط ثابت کرنا ضروری ہوجاتا ہے کہ ہر ڈاکوؤں کے گروہ کو کسی با اثر شخصیت یا خاندان کی پشت پناہی حاصل ہے ۔"

"تو کیا یہ غلط ہے ؟ اخبارات اور سیاسی لیڈر یہ الزام بلا وجہ تو نہیں لگاتے ۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"اخباروں کا تو یہ ہے پروفیسر صاحب کہ برسرِ اقتدار حکومت سے ان کی نورا کشتی چلتی ہے۔ وہ حکومت پر ایسی کڑی تنقید کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کہتے ہیں بھئی واہ ۔حق ادا کردیا۔ کیسا سچّا اور بے باک اخبار ہے۔ کیا کھری کھری سنائی ہیں۔ بس جی، اب دیکھنا حکومت کا کیسا عتاب نازل ہوتا ہے۔ مگر حکومت کا عتاب نازل نہیں ہوتا۔حکومت کہتی ہے کہ دیکھو کتنی آزادیٔ اظہار ہے۔ رہے سیاستداں تو ان کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ گنے چنے خاندان ہیں جن کے پاس حکومت کرنے کا ٹھیکا ہے۔ ایک ہی خاندان کے دو بھائی ہیں تو ایک حکومت میں شامل ہے اور دوسرا حزبِ اختلاف میں ہے۔ باپ وزیر ہے تو بیٹا سیاسی حریف۔ اس طرح اقتدار ہمیشہ گھر میں رہتا ہے مخالفانہ اور تنقیدی بیانات بھی باہمی مشورے اور رضامندی سے ہی جاری ہوتے ہیں۔ اب تو آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ وہ سب جو آپ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، صرف کلاس روم میں پڑھانے کے لیے ہے یا امتحان پاس کرنے کے لیے ۔"

"امتحان پاس کرنے کے لیے بھی اب کتابیں پڑھنا ضروری نہیں رہا۔" پروفیسر نے مایوسی سے کہا۔

"زندہ رہنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھی کتابیں پڑھنا ضروری نہیں رہا سر ۔"

"پھر کیا ضروری ہے ؟" پروفیسر نے سوچ کے کہا۔

"طاقتور ہونا اور طاقت حاصل کرنے کے لیے آپ کا پڑھایا ہوا میرے کام نہیں آیا۔" ڈاکو نادر شاہ ملنگی نے کہا۔"لیکن جو کچھ میں نے گزشتہ تین ماہ میں آپ کو پڑھایا ہے وہ آپ کے کام آسکتا ہے سر۔ فیصلہ کرلیں کیونکہ ابھی وقت ہے۔ آپ کو میرے ساتھ جانا ہے یا نہیں جانا ہے ۔"

زندہ رہنے کے لیے طاقتور ہونا ضروری ہے۔ پروفیسر صداقت نے سوچا، یہ تو وہی نظریہ ہے، ڈارون کا نظریۂ ارتقا۔ وہ سب جاندار صفحۂ ہستی سے مٹ گئے جو ارتقا کے عمل میں بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو قبول نہیں کرسکتے تھے اور خود کو ان حالات کے مطابق بدل نہیں سکتے تھے۔ بڑے بڑے دیو ہیکل ڈائنو سارس۔ اور اسی قبیل کے جانور معدوم ہوگئے۔ اب شیر اور ہاتھی ختم ہورہے ہیں۔ پھر کیا مجھے بھی حالات کے مطابق خود کو بدلنا ہوگا۔ ورنہ بقا کی اس جنگ میں صرف میرے لیے فنا ہوگی۔

سیل کے باہر سنائی دینے والی قدموں کی چاپ کھولی نمبر سترہ کے دروازے پر ختم ہوگئی۔

"آج روانگی ہے بادشاہ ۔" وارڈن نے سامنے آکے کہا۔

"ہاں۔ بہت دن گزار لیے ۔" نادر شاہ نے کہا۔

"بندوبست پکّا ہے نا ؟"

نادر شاہ مسکرایا۔"کچّا کام کبھی کیا ہے ہم نے۔ تمھاری طرف سے تو لائن کلیئر ہے۔ کوئی لال جھنڈی والا تو نہیں ہے ؟"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے بادشاہ۔ لائن کلیئر ہے۔ سب اپنے آدمی ہیں آج ۔" وارڈن نے کہا۔"یہ ٹیپ ریکارڈر . . ."

"یہ میں نے دے دیا ہے ۔" نادر شاہ نے کہا۔"تم پہلے کہتے۔ بجلی کی کیتلی جیلر صاحب کو آفس کے لیے چاہیے ۔"

وارڈن نے خفت سے سر کھجایا۔"چلو کوئی بات نہیں بادشاہ لیکن دیکھو اپنا خیال کرنا۔ ہم بیوی بچّوں والے ہیں ۔"

"یہ تو پہلے ہم دیکھیں گے کہ تم نے کتنا خیال کیا ہے۔ سب ٹھیک رہا تو انعام وعدے کے مطابق ملے گا۔ ورنہ تم جانتے ہو۔ بچّے یتیم ہوجائیں گے اور بیوی ۔ بیوہ ۔ جس نے بھی اپنی ٹانگ اڑائی ۔"

"کس کی مجال ہے بادشاہ، لیکن ایک گزارش تھی . . ."

"بولو. . . کیا پریشانی ہے ؟" نادر شاہ ملنگی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

"خیر سے بچّی بڑی ہوگئی ہے۔ عید کے چاند میں شادی طے کی ہے۔ آپ آؤ گے اسے رخصت کرنے ؟"

"ہاں ہاں۔ بیٹی تو سب کی بیٹی ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ اوپر والے بھی آئیں گے۔ اگر تم بلاؤ گے۔ کوئی خرچے پانی کا مسئلہ ہے ؟" نادر شاہ نے کہا۔"تیاری تو ہے نا ؟"

"وہ تو آپ کی دعا سے بہت پہلے کرلی تھی۔ بس ایک سونے کا سیٹ اور چاہیے۔ لڑکے والے کمینے . . ."

"اچھا اچھا. . . وہ بھی ہوجائے گا ۔" نادر شاہ نے کہا۔ "کہاں سے لینا ہے ؟"

تھوڑے سے مصنوعی تذبذب کے بعد وارڈن نے ایک مشہور جیولر کا نام لیا۔

نادر شاہ نے سر ہلایا۔"ٹھیک ہے۔ لادیں گے یا تمھارے ساتھ بندہ بھیج دیں گے۔ تم خود لے لینا ۔"

" بڑی مہربانی بادشاہ ۔" وارڈن نے اسے سلام کیا اور ٹہلتا ہوا آگے نکل گیا۔ پروفیسر صداقت دم بخود بیٹھے رہے۔

✽

دو سال پہلے پروفیسر صداقت یار خاں کو اچانک احساس ہوا تھا کہ درس و تدریس کا یہ مقدّس پیشہ جس میں گزشتہ دس سال سے ان کو سب کچھ حاصل تھا۔ سکونِ قلب، قناعت کی خوشی اور عزور عزتِ نفس اور سماجی حیثیت۔ وہ پیشہ جس میں وہ کام کو عبادت سے کم نہ سمجھتے تھے کیونکہ پڑھاتے وقت وہ خلوصِ نیت، انہماک اور کامل یقین کے ساتھ کلاس میں حاضر رہتے تھے۔ اس پیشے میں حالات کے تقاضے حائل ہونے لگے ہیں اور ایسے مسائل پیدا ہونے لگے ہیں جو معاشرتی اور سیاسی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔

ایک دن وہ پیریڈ لے کر نکلے ہی تھے کہ انھیں پرنسپل نے طلب کرلیا۔ ان کے ساتھ دو طالب علم بھی تھے جو اُن کے لیکچر کے بارے میں چند نکات کی وضاحت چاہتے تھے اگلا پیریڈ خالی تھا چنانچہ انھوں نے دونوں کو اسٹاف روم میں لے جاکے مطمئن کرنے کا سوچا تھا۔ پرنسپل کے بلاوے کا سن کر انھوں نے لڑکوں سے کہا کہ وہ بعد میں بات کریں گے۔

"بعد میں کب سر ؟" ان میں سے ایک لڑکے نے تیز لہجے میں کہا۔

"یہ بہت نازک مسئلہ ہے ۔" دوسرے نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"نازک مسئلہ . . . !"

"آپ نے ہمارے جذبات کو مجروح کیا ہے ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اگر تم کو کسی معاملے میں مجھ سے اختلاف ہے۔ تو تم مجھ سے کھل کر بات کرسکتے ہو۔ قائل ہونا یا نہ ہونا تمھاری مرضی ۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔"تاریخی حقائق سے کسی کے جذبات کیسے مجروح ہوسکتے ہیں ۔"

"آپ نے حقائق کو مسخ کیا ہے ۔" دوسرے لڑکے نے برہمی سے کہا۔"فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دی ہے۔ اس سے طلبا کے ہر طبقے کے جذبات مشتعل ہوئے ہیں ۔"

"آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ کلاس روم کو اپنے مسلک و نظریات کی تبلیغ کے لیے استعمال کریں ۔"

پروفیسر صداقت حیران رہ گئے۔"تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں سیاسیات کے مضمون کو تاریخ کے حوالے سے پڑھاتا ضرور ہوں لیکن تاریخ میں نے نہیں لکھی ہے۔ اسے میں کیسے مسخ کرسکتا ہوں اور عقائد کا حقائق سے کیا تعلق ۔"

اس اثنا میں اور بھی کچھ لڑکے آگئے تھے۔ واضح طور پر وہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ، پروفیسر صداقت کی ایک بات کو اپنے حق میں استعمال کررہے تھے لیکن دوسری بات سے ان کا مخالف گروہ فائدہ اٹھا رہا تھا۔ انھوں نے دونوں گروہوں کو سمجھا بجھا کے واپس کردیا۔

"تم لوگ غلط سمجھے ہو۔ میری بات کا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں کل اپنے لیکچر میں تفصیل سے بتاؤں گا ۔"

پرنسپل کے کمرے میں انھوں نے ایک معزز صورت شخص کو دیکھا جو تھری پیس سوٹ پہنے کالا چشمہ لگائے بڑی رعونت کے ساتھ پائپ پی رہا تھا۔

"تو آپ ہیں پروفیسر صداقت یار ۔" اس نے بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔"آپ نے مجھے پہچانا ؟"

"آپ کو بھلا کون نہیں پہچانتا ۔" پروفیسر صداقت نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"آپ کی تصاویر اخبارات میں اکثر شائع ہوتی ہیں اور میرے نہ سہی، آپ میرے حلقے سے اسمبلی کے رکن بھی ہیں ۔"

"آپ نے کیا کسی اور کو منتخب کیا ہے ؟ رہتے تو آپ بھی میرے حلقۂ انتخاب میں ہیں ؟" وہ طنز سے مسکرایا۔

"دراصل میں نے آپ کے حق میں اپنا ووٹ استعمال نہیں کیا تھا ۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"پھر کسے دیا تھا آپ نے ووٹ ؟ اس لیچڑ وکیل کو . . ."

"یہ میں آپ کو کیسے بتاسکتا ہوں۔ ووٹ کی رازداری میرا حق ہے۔ انتخابی مہم کے دوران بھی آپ کا رویّہ ناشائستہ رہا تھا لیکن اب آپ جیت گئے ہیں تو آپ کو زیادہ کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جو ہار گئے انھیں گالیاں دینے کے بجائے . . ."

"پروفیسر صاحب ۔ مجھے سیاسیات یا اخلاقیات پر لیکچر مت دیں ۔" وہ خفگی سے بولا۔"میں آپ کا طالب علم نہیں ہوں ۔"

اس مرحلے پر صورتِ حال کو پرنسپل نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔"بھئی، یہ اشرف کے والد ہیں ۔"

"کون اشرف ؟"

"وہ جو ہمارے کالج میں پڑھتا تھا ۔" پرنسپل نے کہا۔"لیکن پھر. . . یہاں سے چلا گیا تھا ۔"

"مجھے یاد آگیا۔ اسے غالباً نکال دیا گیا تھا ۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔"مس کنڈکٹ پر . . ."

"وہ. . . کچھ غلط فہمی کی بنا پر۔ ایسا ہوا تھا ۔" پرنسپل نے اپنے ماتھے پر رومال پھیر کے پسینہ خشک کیا۔

"غلط فہمی کیسی سر۔ سب کے سامنے اس نے امتحان گاہ میں خنجر نکال لیا تھا ۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔"اور ڈیسک پر گاڑ

کے نقل کرتا رہا تھا۔"

"چلیں چھوڑیں اس بات کو۔" اشرف کے باپ نے تند لہجے میں کہا۔ "میں نے اسے دوسرے بہتر کالج میں داخل کرا دیا تھا۔ اس وقت میرے آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ بتائیے ان کو پرنسپل صاحب۔"

"صداقت صاحب۔" پرنسپل نے ایک چٹ ان کی طرف بڑھا کے کہا۔ "یہ اشرف کا رول نمبر ہے۔ جس نے بی اے فائنل کا امتحان دیا ہے اس سال۔"

"بڑی اچھی بات ہے لیکن میں اس کا کیا کروں؟" انھوں نے کاغذ کے اس پرزے کو میز پر رکھ دیا۔

"پولیٹیکل سائنس کی کچھ کاپیاں آپ کے پاس آئی ہیں صداقت صاحب۔" پرنسپل نے کہا۔ "ان میں اشرف کی کاپی بھی ہے۔ اب ملک صاحب نے باقی مضامین کے بارے میں بتایا ہے کہ اشرف کے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے لیکن جس دن اس کا پولیٹیکل سائنس کا پرچہ تھا، اس رات وہ بیمار تھا اور اس نے بیماری کی حالت میں ہی امتحان دیا تھا۔"

"ایک سو چار ٹمپریچر تھا اسے۔" ملک صاحب نے کہا۔

صداقت صاحب سمجھ گئے۔ "آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے پاس کر دوں۔ دوسرے مضامین کے لیے بھی آپ نے انتظام کر لیا ہو گا۔"

"جی ہاں۔ میں صاف بات کرتے ہوئے ڈرتا نہیں۔ انگلش، اردو اور معاشیات میں اس کے نمبر بھی بتا سکتا ہوں میں آپ کو۔" ملک صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ کون سی ڈویژن لے گا، یہ بھی معلوم ہو گا آپ کو ــــ" صداقت صاحب نے بھی اکھڑے لہجے میں کہا۔

"انشاءاللہ فرسٹ کلاس ہو گی اس کی۔ آپ صرف اسے پاس کر دیں۔" ملک صاحب نے کہا۔ "وہ کچھ بھی نہیں لکھ پایا تھا۔"

"پھر آپ میری طرف سے اس کے حاصل کردہ نمبر بھی لکھ لیں۔ صفر۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"آپ اسے فیل نہیں کر سکتے۔"

"ملک صاحب، مجھے دھمکی مت دیں۔ میں اسے فیل ہی نہیں کر سکتا، تین سال تک امتحان دینے کا نااہل قرار دینے کے لیے سفارش کر سکتا ہوں۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "سنڈیکیٹ میری سفارش کو مسترد نہیں کر سکتا۔ سمجھے آپ۔"

"پلیز ــ پلیز صداقت صاحب۔" پرنسپل نے پریشان ہو کے کہا۔ "ملک صاحب، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل فکر مت کیجیے۔ تشریف رکھیے دونوں حضرات۔"

ملک پھر بیٹھ گیا۔ "اگر اشرف پاس نہ ہوا . . ."

"صداقت صاحب!" پرنسپل نے درمیان میں بات شروع کر دی۔ "وہ معاملہ دراصل یہ ہے کہ اشرف کی عمر چوبیس سال ہو گئی ہے اور اس سال وہ بی اے نہ کر سکا تو آئندہ سال اس کی عمر زیادہ ہو جائے گی۔ وہ امتحان ہی نہیں دے سکے گا اور یہ سوال ہے اس کے مستقبل کا۔"

"اس کے مستقبل کا یا ملک کے مستقبل کا؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "جو بی اے یوں پاس کرے گا، وہ مقابلے کا امتحان کیسے پاس کرے گا اور خدانخواستہ یہ ملک اتنا ہی بدقسمت ثابت ہوا کہ اشرف جیسے . . ."

"آپ میرے صبر اور حوصلے کا امتحان مت لیں پروفیسر صاحب۔" ملک نے مشتعل ہو کے کہا۔ "اشرف کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ جب تک اس کا باپ میں ہوں۔"

"تو پھر آپ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیں ملک صاحب کہ جب تک اس کا ممتحن میں ہوں، وہ پاس نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے امتحانی کاپی میں کچھ نہیں لکھا ہو گا تو اس کے نمبر اتنے ہی ہوں گے جتنے میں بتا چکا ہوں۔" پروفیسر صداقت نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "اسے کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے اپنے مستقبل کی، جب تک اس کا باپ زمیندار، صنعتکار اور وزارت کا امیدوار ہے لیکن مجھے ضرور فکر کرنی چاہیے اس قوم کے مستقبل کی۔"

وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھے۔ زندگی میں پہلے بھی مشکل مقام آئے تھے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے فیصلہ اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کیا ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ جب وہ کوئی غلط کام نہیں کرتے تو انھیں کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اپنے طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ اپنی سادگی، اپنی علمیت اور اپنی انسان دوستی کی صفات کے باعث انھیں اساتذہ کے درمیان بھی ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ وہ قناعت پسندی اور درویشی کی زندگی سے خوش تھے اور خوب سے خوب تر کے بجائے زیادہ سے زیادہ کی جستجو کرنے والوں کی دوڑ میں شامل ہونا نہیں چاہتے تھے ــــ اپنی آمدنی انھیں کافی محسوس ہوتی تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد وہ ایک بچّے کے باپ بن گئے تھے۔ ان کی بیوی شاہینہ بھی صابر و شاکر عورت تھی۔ چنانچہ وہ ہر قسم کے تفکّرات سے آزاد تھے۔ کالج سے واپس آنے کے بعد جو وقت ملتا تھا، وہ بھی پڑھنے پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور طلبا ان سے گھر پر بھی پڑھنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ٹیوشن وہ کسی کو نہیں پڑھاتے تھے حالانکہ ان کو صرف ایک گھنٹا پڑھانے کے لیے پانچ سو روپے تک دینے والے بہت تھے۔ اگر وہ تین چار صاحبِ ثروت خاندان کے نالائق لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانا قبول کر لیتے تو ان کی آمدنی دُگنی سے بھی زیادہ ہو سکتی تھی مگر وہ ایسی آمدنی کو ناجائز شمار کرتے تھے۔ شاہینہ نے ایک بار ان سے کہا تھا کہ ٹیوشن فیس لینے

میں کیا حرج ہے۔ آخر آپ یوں بھی تو ان کو پڑھاتے ہیں۔“

”وہ اور بات ہے شانی۔ مگر میں اسے دولت کمانے کا ناجائز ذریعہ نہیں بنا سکتا۔“

”اسے ناجائز کیوں کہتے ہیں آپ جب کہ یہ محنت کا معاوضہ ہوگا۔“ شاہینہ نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے شانی کہ دوسرے اساتذہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے طلبا کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ اپنے علم کو بلیک میں بیچ رہے ہیں۔ وہ کلاس روم میں جانتے بوجھتے کچھ نہیں پڑھاتے۔ محنت نہیں کرتے اور کچھ سمجھاتے نہیں۔ جسے واقعی علم حاصل کرنا ہے اور کچھ سمجھنا ہے وہ ان کے گھر پر ٹیوشن پڑھے۔ ان کو منہ مانگا معاوضہ دے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ جو مجھے معاوضہ ملتا ہے وہی کافی ہے۔“

”آج کافی ہے۔ کل کی ضروریات کے بارے میں آپ کیوں نہیں سوچتے؟“ شاہینہ نے کہا۔

”کل کے بارے میں کون جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔“

”پھر بھی مستقبل کی فکر سب کرتے ہیں۔“ شاہینہ نے کہا۔

”میرا مستقبل اتنا تاریک تو نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں۔ مجھے اس نے عزت دی ہے۔ تم جیسی شریکِ حیات دی ہے۔ صحت دی ہے۔ اور کیا چاہیے۔“

”ساری عمر ایسے ہی رہیں گے ہم کرائے کے مکان میں؟“ شاہینہ نے کہا۔

”نہیں۔ ایک پلاٹ ہے میرے پاس۔ اللہ نے چاہا تو اس پر لون لے کر مکان بھی بنا لیں گے۔“ پروفیسر صداقت نے کہا۔

”آپ کے ساتھی۔ دوسرے پروفیسر کیسے رہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا ہے آپ نے؟“

”ہاں۔ ان کے پاس اسکوٹر ہیں۔ کاریں بھی ہیں۔ مگر وہ سب انھیں ورثے میں ملا ہے یا انھوں نے ایسے ذرائع اختیار کر کے حاصل کیا ہے جو میں نہیں کر سکتا۔“

اس رات انھوں نے شاہینہ کو ملک صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سب بتا دیا۔

”وہ بہت خطرناک اور با اثر آدمی ہے۔“ شاہینہ نے خوف زدہ ہو کے کہا۔

”ہوگا۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ڈرنے کی۔ ہمارے ساتھ بھی تو ہمارا خدا ہے۔“ پروفیسر صداقت نے کہا۔ ”کیا تم نے سنا نہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہوتا ہے۔“

صبح جب وہ کالج پہنچے تو وہاں اندر اور باہر پولیس متعین تھی۔ ماحول سخت کشیدہ تھا اور طلبا کالج کے باہر جمع ہو کے نعرے لگا رہے تھے۔ پولیس نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ ورنہ وہ پروفیسر صداقت پر بھی حملہ کر دیتے۔ وہ انھی کے خلاف نعرے بھی لگا رہے تھے اور ہاتھوں میں بینر اٹھائے کھڑے تھے۔ پروفیسر صداقت کو کالج کی دیواروں پر اپنے خلاف صادر کیے جانے والے ’فتوے‘ اور مختلف نعرے بھی نظر آئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”یہ سب کیا ہے سر؟“ انھوں نے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہو کے کہا۔

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“ پرنسپل تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ ”حالانکہ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”میری وجہ سے؟“ پروفیسر صداقت پریشان ہو گئے۔

”جی آپ کی وجہ سے۔“ پرنسپل نے درشت لہجے میں کہا۔ ”کل آپ نے کلاس میں کیا پڑھایا تھا؟“

”وہی جو میرا مضمون ہے۔“

”یہ مضمون آپ کئی سال سے پڑھا رہے ہیں لیکن ابھی تک آپ کو یہ معلوم نہیں کہ کلاس روم میں طلبا کے سامنے آپ کے لیکچر کو نصاب تک محدود رہنا چاہیے۔ ایک بار نہیں دس بار شکایات ملی ہیں مجھے کہ آپ سیاسیات نہیں پڑھاتے۔ کلاس میں سیاست کرتے ہیں۔ آپ کا لیکچر سیاسی رنگ لیے ہوتا ہے جس میں آپ اپنے نظریات و عقائد ٹھونس دیتے ہیں۔ ہر بار میں نظر انداز کرتا رہا۔“

”ایسی کسی شکایت کا آپ نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔“

”کیا یہ بھی میری غلطی ہے؟“ پرنسپل نے میز پر مکّا مارا۔ ”اگر میں نے آپ کا لحاظ کیا اور طلبا کو سمجھا بجھا کے معاملہ ختم کر دیا تو کیا میں نے برا کیا۔ یہ بتائیے مجھے کہ کل کیا ہوا تھا؟“

”میرے خیال میں تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔“

”غلط کہتے ہیں آپ۔“ پرنسپل نے کہا۔ ”مجھے رپورٹ ملی ہے آپ نے کہا تھا کہ اورنگ زیب شکّی مزاج اور سخت گیر تھا۔ اکبر کے محل میں ہندو رانیاں تھیں۔ جہانگیر ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا تھا۔ آپ کے لیکچر سے مسلمان بادشاہوں کے خلاف تعصّب کی بُو آتی ہے۔ آپ نے طلبا کے جذبات کو مجروح کیا۔ اسلامی مغل سلطنت کا مذاق اڑایا۔“

”نہ میرا مقصد کسی کی دلآزاری تھا اور نہ میں نے کوئی غلط بات کہی تھی۔“ پروفیسر صداقت نے احتجاج کیا۔

”پھر کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ اب مسلمانوں کو حکومت ملی ہے تو وہ پھر عیش و عشرت میں پڑ گئے ہیں۔“ پرنسپل نے کہا۔ ”اس قوم کا حشر برا ہوگا۔“

”میں تاریخ کے حوالے سے بات کر رہا تھا اور میں نے وہی بتایا تھا جو مستند مؤرخین کی رائے ہے۔“ پروفیسر صداقت نے کہا۔

”میں پوچھتا ہوں کہ سیاسیات کے مضمون میں تاریخ کہاں سے آگئی؟“ پرنسپل نے دہاڑ کے کہا۔

”کیا سیاست الگ ہے تاریخ سے؟ اور کیا سیاسی تجزیہ کیے بغیر تاریخ پڑھائی جا سکتی ہے یا تاریخ کے حوالوں کے بغیر سیاست کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہر حکومت کی تبدیلی ایک سیاسی عمل ہوتی ہے اور اس کی سیاسی وجوہ کو دیکھنا پڑتا ہے۔ کیا مغلیہ خاندان کے زوال کے اسباب یا ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کی ناکامی کے سیاسی اسباب کو سمجھے بغیر ہم جان سکتے ہیں کہ انگریز ہندوستان پر کیوں قابض ہو گئے تھے۔ یہ سب سیاست ہی تو ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ سیاسیات ایک مضمون ہے۔ مگر اس کا ایک نصاب ہے۔“ پرنسپل نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”اس نصاب میں آج کی سیاست شامل نہیں ہے۔ اس کا تجزیہ کرنا آپ کا کام نہیں ہے کہ ہمارے سیاسی نظام میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کا ذمّے دار کون ہے۔ طلبا کو امتحان پاس کرنا ہے۔ سیاستداں نہیں بننا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک آج ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ قصوروار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ سب تو میں کئی سال سے پڑھا رہا ہوں اور میرے نظریات کبھی نزاع کا سبب نہیں بنے۔“ پروفیسر صداقت نے برہمی سے کہا۔ ”یہ طلبا سیاستداں بنیں گے یا نہیں، یہ نہ آپ جانتے ہیں نہ میں جانتا ہوں، مگر ان کو سیاسیات پڑھنے کے بعد یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک اچھے سیاسی نظام کے لوازمات کیا ہوتے ہیں اور۔ جب تک ان کا سیاسی شعور . . .“

”دیکھیے پروفیسر صاحب! کئی سال سے آپ کیا پڑھا رہے تھے، یہ میں جانتا ہوں۔“ پرنسپل نے لہجہ بدل کے کہا۔ ”لیکن آج حالات وہ نہیں ہیں جو کئی سال پہلے تھے۔ آپ کو وقت کی نزاکت کا احساس ہونا چاہیے۔ آزادیٔ اظہار کے مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔ جو بات آپ کل کہہ سکتے تھے، وہ آج نہیں کہہ سکتے اور جو آج کہیں گے، وہ آنے والے کل کو سامنے رکھ کر کہیں گے تاکہ آپ گرفت میں نہ آئیں۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ اتنا سنگین نہیں تھا، جتنا بنا دیا گیا ہے۔ آپ نے اکبرِ اعظم اور اورنگ زیب کے بارے میں جو کچھ کہا، اسے بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ یہ دو فریق ہے متحارب سیاسی نظریات رکھنے والوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے درمیان اختلاف کو ہوا دی گئی۔ اس کے نتیجے میں کشیدگی بڑھی اور آج کلاسیں شروع ہونے سے پہلے ہی دونوں گروہ آپس میں الجھ گئے۔ آپ نے وہ بینر ضرور دیکھے ہوں گے جو طلبا کے ایک گروہ نے اٹھا رکھے ہیں۔“

”میں نے تو دیواروں پر لکھے ہوئے نعرے بھی پڑھے ہیں۔“ پروفیسر صداقت نے افسوس سے سر ہلایا۔

”اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس ہنگامے کے لیے راتوں رات تیاری کی گئی۔“ پرنسپل نے کہا۔ ”پولیس کے آجانے سے زیادہ خون خرابا نہیں ہوا لیکن اب طلبا کی دونوں تنظیموں کے حامی باہر جمع ہیں اور وہ جلوس بنا کے دوسرے کالجوں میں جانا چاہتے ہیں۔ ایک تنظیم آپ کی برطرفی کا مطالبہ کر رہی ہے، دوسری نے آپ کو حق و صداقت کا ترجمان بنا لیا ہے۔ بہت جلد یہ معاملہ سیاسی رخ اختیار کرے گا۔ ایک طبقہ آپ کو اسلام دشمن، وطن دشمن اور سامراجی ایجنٹ قرار دیتے ہوئے آپ کے لیے سخت ترین سزا کا مطالبہ کرے گا۔ دیواروں پر لکھے گا ’صداقت کو پھانسی دو۔‘ دوسرا میرے خلاف مظاہرے کرے گا۔“

”آپ کے خلاف کیوں؟“ پروفیسر صداقت نے حیران ہو کے کہا۔

”اس لیے کہ میں آپ کو فوری طور پر معطّل کر رہا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ کیونکہ مجھے اوپر سے احکامات موصول ہوئے ہیں۔ میں احکامات آپ کو دکھا نہیں سکتا کیونکہ مجھ سے سب کچھ زبانی کہا گیا ہے اور میں مجبور ہوں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو صورتِ حال بہت سنگین ہو جائے گی۔ میرے خلاف مظاہرے کرنے والوں کو دبا دیا جائے گا یا زیادہ سے زیادہ میرا بھی تبادلہ ہو جائے گا لیکن میں نے آپ کے خلاف قدم نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی رخنہ اندازی کی جائے گی۔ آپ کے مخالفین کو ان کی پشت پناہی حاصل ہے جو برسرِ اقتدار ہیں۔ کیا اب بھی آپ نہیں سمجھے؟“

”میں سمجھ گیا۔ یہ سب اشرف کے باپ ملک نے کیا ہے۔“ پروفیسر صداقت نے کہا۔ ”اسی کے ایما پر میرے خلاف ہنگامہ شروع کیا گیا ہوگا۔ اسی نے آپ پر دباؤ ڈلوایا ہوگا۔“

”میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔“ پرنسپل نے ان سے نظر ملائے بغیر کہا۔ ”میں سخت مشکل میں پڑ گیا ہوں۔“

باہر اب بھی سخت نعرے بازی ہو رہی تھی۔

”مجھے اندیشہ ہے کہیں صورتِ حال کو خراب کرنے کے لیے پولیس آنسو گیس استعمال کرنے یا لاٹھی چارج پر نہ اتر آئے۔“ پرنسپل نے تشویش سے کہا۔

”میں طلبا کو سمجھا دیتا ہوں۔“ پروفیسر صداقت نے کہا۔ ”ان سے غیر مشروط معافی مانگ لیتا ہوں تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔“

”نہیں نہیں۔“ پرنسپل نے گھبرا کے کہا۔ ”آپ ان کے سامنے مت جائیں۔ خدانخواستہ... کہیں ایسا نہ ہو کہ . . .“

"آپ کا مطلب ہے، وہ مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ مار ڈالیں گے مجھے۔" پروفیسر صداقت نے پرنسپل کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ میرے طالب علم ہیں پرنسپل صاحب۔"

پرنسپل نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہی تو آپ نہیں سمجھ رہے ہیں۔ ان کے درمیان کچھ باہر کے لوگ بھی آگئے ہیں۔ اشتعال انگیزی وہی کر رہے ہیں۔"

"کیا طلبا ان کو پہچانتے نہیں ؟"

"چند طلبا بھی ہیں ان کے ساتھ۔ میں جانتا ہوں وہ کون ہیں۔ وہ کالج میں پڑھنے کے لیے نہیں آتے بلکہ لیڈر بننے کے لیے آتے ہیں اور خواہ وہ کتنے ہی افلاطون بننے کی کوشش کریں، ہیں تو ناتجربہ کار، ناپختہ عقل و شعور رکھنے والے نوجوان۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کو لیڈر بنانے والے ہاتھ انھیں اپنے مفاد میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ آپ کو ان کے سامنے بالکل نہیں جانا چاہیے صداقت صاحب۔ کسی اجنبی ہاتھ نے آپ پر گولی چلا دی تو صورتِ حال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ موقع کے متلاشی آپ کو شہیدِ صداقت بنا دیں گے۔ وہ آپ کی موت کو جمہوریت کی موت قرار دیں گے۔ جلسے جلوس، ہنگامے، ہڑتالیں کرائیں گے اور ظاہر ہے، حکومت انھیں دبانے کے لیے قوت استعمال کرے گی۔"

نتائج کا تصوّر کر کے پروفیسر صداقت کانپ گئے۔ پرنسپل جہاندیدہ آدمی تھا۔ وہ صداقت کا دشمن نہیں تھا مگر مصلحت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پروفیسر صداقت سر جھکائے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ پیچھے سے نکل جائیں۔" پرنسپل نے کہا۔ "میں جا کے طلبا لیڈروں کو مذاکرات کے لیے بلاتا ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے آدھے گھنٹے میں آنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے، وہ حالات کو سنبھال لے گا۔ میں آپ کی معطلی کا مطالبہ تسلیم کر لوں گا۔ مگر دوسرے فریق کے اطمینان کے لیے غیر جانبدارانہ تحقیقات کا حکم بھی دے دیا جائے گا۔ انھیں بھی مطمئن کر دیا جائے گا کہ پروفیسر صداقت بے قصور پائے گئے تو ان کو باعزّت طور پر ملازمت پر بحال کر دیا جائے گا۔"

❋

پروفیسر صداقت سخت دل گرفتہ اپنے گھر پہنچے اور بیڈ پر لیٹ گئے۔ خلافِ معمول وہ جلد گھر لوٹ آئے تھے اور صورت سے وہ بیمار ہی نہیں بدحال بھی لگ رہے تھے۔ شاہینہ گھبرا گئی۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمھاری ؟"

"طبیعت ٹھیک ہے۔" انھوں نے بیوی کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"پھر کیا ہوا ہے۔ مجھ سے بھی چھپاؤ گے ؟"

"مجھے معطّل کر دیا گیا ہے۔"

"کس جرم میں ؟" شاہینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"صداقت کے جرم میں۔" پروفیسر صداقت اپنی بات پر زبردستی مسکرائے۔ پھر انھوں نے مختصراً شاہینہ کو سب بات بتا دی۔

شام کے وقت کال بیل بجی تو وہ باتھ روم میں تھے۔ جب وہ باہر نکلے تو شاہینہ نے انھیں بتایا کہ "ملک صاحب آئے ہیں۔ میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

پروفیسر صداقت کا موڈ آف ہو گیا۔ "بٹھانے کو کس نے کہا تھا ؟"

"گھر آئے مہمان کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کرو گے ؟" شاہینہ نے بُرا مان کے کہا۔ "وہ ایک اہم شخصیت ہے، اسمبلی کا رکن ہے اور خود چل کے تمھارے پاس آیا ہے۔"

"بڑا احسان ہے اس کا ورنہ وہ مجھے بھی بلوا سکتا تھا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ وہ کیوں آیا ہے۔"

"دیکھو کچھ بھی ہو۔ آرام سے بات کرنا۔ معاملے کو زیادہ اُلجھانے کی کوشش مت کرنا۔" شاہینہ نے درخواست کے انداز میں کہا۔

ملک صاحب اس وقت مجسّم شائستگی بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ پروفیسر صداقت سے اٹھ کر مصافحہ کیا۔

"میں کل کی بات پر معذرت کرنے آیا تھا۔" ملک نے کہا۔

"چلیے، جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"مجھے دوپہر کے بعد معلوم ہوا کہ آپ کے خلاف کسی غلط فہمی کی بنا پر کالج میں ہنگامہ ہو گیا۔" ملک نے انجان بننے کی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ "بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ لونڈے ابھی بالشت بھر کے ہوتے نہیں، سیاست کرنے لگتے ہیں۔ ارے بابا ہمارے بال سفید ہو گئے اس دلدل میں۔"

"آپ سیاست کو دلدل سمجھتے ہیں ؟"

"اور کیا ہے یہ۔ ایک بار جو اس میں قدم رکھ دیتا ہے، وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ نہ دین کا نہ دنیا کا۔ نہ اپنوں کا نہ پرایوں کا۔ دوست بھی خفا اور دشمن تو خیر دشمن ہی ہے۔ ہزاروں مسائل لے کر روز آ جاتے ہیں لوگ کہ جی ہم نے ووٹ دیا تھا۔ اب کام کرو ہمارا۔ آپ بتائیے، ان کو کیسے سمجھاؤں کہ میرے وسائل اور میرے اختیارات سب محدود ہیں۔ الٰہ دین کا چراغ نہیں ہے میرے پاس۔"

"انتخابی مہم میں آپ کے دعوے سن کے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کے ایک ہاتھ میں نہیں دونوں ہاتھوں میں الٰہ دین کے چراغ ہیں۔ لوگ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں تو ان کا کیا قصور۔ خیر آپ فرمائیے۔ غریب خانے کی عزت افزائی کا خیال کیسے آ گیا ؟"

"بھئی پروفیسر صاحب! اختلافات اپنی جگہ، آپ نے ہمیں ووٹ نہیں دیا آپ کی مرضی۔" ملک نے کہا۔ "لیکن ہم تو آپ کے بھی خادم ہیں اور پھر میرے حلقے میں آپ جیسے صاحبانِ علم کتنے ہیں ؟ میں نے سوچا کہیں آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں، اس لیے آ گیا۔ آنے سے پہلے میں نے منسٹر صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ملے نہیں۔ رات کو انشاءاللہ بات ہوگی۔ میں آپ کی بحالی کے احکامات کل ہی جاری کرا دوں گا۔"

"آپ کا بہت شکریہ۔ اگر مجھے تحقیقات کے نتیجے میں بحال نہ کیا گیا تو میں استعفا دے دوں گا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"چھوڑیں صداقت صاحب۔ یہ تحقیقات وغیرہ کا چکر تو لمبا ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جو اوپر والے چاہتے ہیں۔ آپ کی اتنی عزت ہے اور ماشاءاللہ مانے ہوئے استاد ہیں آپ۔ اپنا کیریئر کیوں داؤ پر لگاتے ہیں۔" ملک صاحب نے کہا۔ "میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"تاکہ آپ کا ایک احسان ہو جائے مجھ پر اور اس کا بدلہ مجھے آپ کے نالائق بیٹے اشرف کو پاس کر کے چکانا پڑے۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

ملک کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کے گزر گیا۔ "پروفیسر صاحب! دنیا کا یہی دستور ہے۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے اور دنیا ہی کیا، کائنات کو دیکھیے۔ ستارے ایک دوسرے کی کشش کے سہارے پر قائم ہیں۔ اگر میں آپ کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہوں تو آپ پر بھی لازم ہے کہ مجھے سہارا دیں۔"

"میں سہارا دوں آپ کو ؟" پروفیسر نے ہنس کے کہا۔

"پہلے میری پوری بات سن لیں۔" ملک نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اشرف میرا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ باقی دو اس سے چھوٹے ہیں۔ آپ کی دعا سے اُسے کسی چیز کی کمی نہیں۔ میرے دو شوگر مل ہیں۔ کچھ شپ بریکنگ کا بزنس ہے۔ دو کمرشل پلازا ہیں اسی شہر میں اور خاصی زرعی اراضی ہے۔ یہ سب وہ سنبھال سکتا تھا مگر میں نے دیکھا کہ اس کا ذہن کاروباری نہیں ہے۔"

"وہ آپ کے نقشِ قدم پر چل کے سیاستداں کیوں نہیں بن جاتا۔ یہ بھی تو خاصا منافع بخش پیشہ ہے۔"

"سوچا میں نے یہی تھا لیکن وہ بی اے تک پہنچ گیا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔" ملک صاحب نے کہا۔ "میں نے سوچا کہ فیملی میں کوئی اعلا اختیارات رکھنے والا سرکاری افسر بھی ہونا چاہیے تاکہ سرکاری کام بھی ہوتے رہیں۔ ایک بار وہ منتخب ہو جائے گا اور منتخب کیوں نہیں ہوگا۔ ہم کیا مر گئے ہیں۔ بعد میں بھی اس کی پوسٹنگ جس محکمے میں ہم چاہیں گے ہو جائے گی۔ اس سے چھوٹے دونوں نالائق ہیں۔ سب سے چھوٹا بے وقوف بھی ہے۔ کاروبار خاک سنبھالے گا۔"

"چنانچہ اسے آپ سیاست کے میدان میں اتار دیں گے۔" پروفیسر نے تلخی سے کہا۔

ملک ہنسنے لگا۔ "وہ کچھ تو کرے گا ناجی۔ اور ہمارے ساتھ رہے گا تو سیاست سیکھ ہی لے گا۔ مسئلہ تھا اشرف کا۔ آپ کا تھوڑا سا تعاون چاہیے۔ وہ بھی تمام عمر آپ کا خادم رہے گا۔"

"مجھے افسوس ہے ملک صاحب کہ میں اس کی کاپی دیکھ چکا ہوں۔ اس نے رول نمبر کے ساتھ اپنا نام اور ولدیت لکھ کے ایک جرم کیا ہے، وہ میں نظر انداز کر دیتا ہوں۔ شاید اس کا مقصد مجھے یاد دلانا ہوگا کہ وہ کون ہے اور کس کا بیٹا ہے۔ تاہم کوری کاپی پر میرے لیے اس کو صفر سے زیادہ نمبر دینا ممکن نہیں تھا اور وہ میں دے چکا۔"

"پھر کیا ہوا جی۔" ملک نے کہا۔ "امتحانی کاپی دوسری آ جائے گی، مکمل جوابات کے ساتھ، اسی کی ہینڈ رائٹنگ میں۔ یا وہ خود آ جائے گا کاپی لے کر اور آپ کے سامنے بیٹھ کے پرچا حل کر لے گا۔"

"ملک صاحب! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ میرے گھر میں مہمان بن کے آئے ہیں۔۔"

"ادجی گولی مارو مہمان کو۔" ملک نے کہا۔ "مسئلہ آپ کا بھی تو ہے۔ مجھے معلوم ہے، آپ رشوت نہیں لوگے۔ ورنہ خالی چیک آپ کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔ پھر بھی میں بہت کچھ کر سکتا ہوں آپ کے فائدے کے لیے۔ گورنمنٹ کالج میں پرنسپل ریٹائر ہونے والا ہے۔ آپ جائیں اور چارج لیں۔ آرڈر پہنچ جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب آپ جائیں۔ اشرف کے لیے عمر کی انتہائی حد میں رعایت حاصل کرنا آپ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر تک بی اے پاس کر سکتا ہے۔"

ملک کھڑا ہو گیا۔ "دیکھو پروفیسر! میں آخری بات کرتا ہوں۔ اگر اشرف کو تم نے پاس نہ کیا تو کوئی اور کرے گا۔ تم معطّل ہو اور معطّل ہی رہو گے۔ امتحانی کاپیاں تم سے لے کر کسی اور کو پہنچا

دی جائیں گی۔ ملک کو استادوں کی عزت کرنا سکھایا گیا تھا اس لیے وہ تمھارے دروازے پر آگیا تھا۔ مگر اس کی اپنی بھی عزت ہے۔ اس سے کھیلنے کی کوشش مت کرو۔ میں برطانوی طرز کا ایک بہت بڑا انگلش میڈیم اسکول قائم کر رہا ہوں۔ اس کا افتتاح آئندہ تعلیمی سال کے آغاز سے پہلے خود وزیر تعلیم کریں گے۔ اس میں شہر کے اعلاترین خاندانوں کے بچے پڑھنے آئیں گے۔ میں تم کو آج سے اس کا پرنسپل مقرر کر سکتا ہوں۔ سوچو کتنی عزت حاصل ہوگی تمھیں اور تمھاری تنخواہ ہوگی دس ہزار روپے ماہانہ۔ اور اس کے بدلے تم کو اپنے پاس سے کچھ نہیں دینا۔ اشرف کو چالیس نمبر دینے میں تمھارا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔ کل تک سوچ لو۔"

"سوچنے کی بات پر مجھے یاد آیا" پروفیسر صداقت نے سکون سے کہا "میں امتحانی کاپیاں نمبر لگانے کے بعد فہرست کے ساتھ رجسٹرار کو ارسال کر چکا ہوں۔ وزیر تعلیم کا ذکر آپ نے دو بار کیا۔ آج رات ان سے آپ کی بات ضرور ہوگی۔ آپ کے کہنے سے وہ یقیناً مجھے برخواست کر دیں گے۔ مجھے پروا نہیں کیوں کہ وہ مجھ سے نوکری تو چھین سکتے ہیں مگر میرا علم نہیں چھین سکتے آج وہ وزیر ہیں۔ اگلے انتخابات کے بعد کیا ہوگا، کیا وہ وزیر ہوں گے۔ میں تو شاید پھر پروفیسر بن جاؤں گا۔"

ملک نے پنجابی فلموں کے ولن کی طرح ایک قہقہہ مارا۔

"اوئے پاگل دے پتّر۔ اگلے انتخابات میں کیا زمین اوپر ہو جائے گی اور آسمان نیچے آجائے گا۔ کوئی اور وزیر تعلیم ہوگا تو کیا تو ہوگا؟ تیری باری کبھی نہیں آئے گی پروفیسر۔ صرف چھ مہینے کی بات ہی تو ہے۔ تو دیکھ لینا ہم بھی یہیں ہوں گے۔"

"پرانے وقت کو بھول جائیں ملک صاحب، جب آپ نے دھن، دھاندلی اور دھونس کے حربے استعمال کر کے انتخابات جیت لیے تھے۔ آج کا ووٹر بہت باشعور ہے۔ اس نے آزما کے دیکھ لیا ہے آپ کو۔ اب آپ اسے نہیں خرید سکتے۔" پروفیسر نے بڑے یقین سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم جیسے مٹھی بھر دانشور اور حزب اختلاف کے کچھ لیڈر کس طرح رائے عامہ کو گمراہ کر رہے ہیں لیکن ہم بھی بے خبر نہیں ہیں۔ تم سب کا بندوبست ہو جائے گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"کچھ اپنا بندوبست بھی کر لینا ملک صاحب" پروفیسر نے دروازے تک جا کے کہا "بہت لوٹا آپ جیسے سیاستدانوں نے اس قوم کو۔ بہت بے وقوف بنا لیا۔ اب بساط سمیٹ لیجیے۔"

رات تک ان کی معطلی کی خبر سارے شہر میں پھیل چکی تھی۔

کالج کے ہنگامے کو حکومت نے شرپسندوں کی سازش قرار دیا اور حکومت کے مخالفوں نے آمرانہ ہتھکنڈوں سے تعبیر کیا۔ اگلے دن کے اخبارات میں دونوں طرف سے دیے جانے والے بیانات شائع ہوئے۔ حکومت کے مخالفین نے پروفیسر صداقت کی معطلی کی سخت مذمت کی اور کہا کہ اس طرح حکومت صداقت کی آواز کو دبا نہیں سکتی۔ حکومت کی طرف سے حزب اختلاف پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ ایک معمولی واقعے کو اُچھال کے سیاسی فائدے حاصل کرنا چاہتی ہے۔

دوپہر تک ان کے پاس ایک درجن سے زائد اخبار والوں کے اور سیاستدانوں کے فون آچکے تھے۔

"ہمیں آپ جیسے ہی باضمیر اور نڈر لوگوں کی ضرورت ہے" ایک سیاستداں نے کہا "آپ نے حکومت پر تنقید کی تو یہ آپ کا حق ہے۔"

"لیکن میں نے تو..."

"ہمیں سب معلوم ہو گیا ہے" سیاستداں نے کہا "اس قوم کے نونہالوں کو صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے اور آپ کا جرم صرف یہی ہے کہ آپ نے ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ساری قوم کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس حکومت کی پالیسی نے ملک کو تباہ کر دیا ہے۔ بیرونِ ملک بھی..."

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں مگر..."

"انشاءاللہ شام کو ہماری پارٹی کا ایک وفد آپ سے ملاقات کرے گا اور آپ کو دعوت دے گا کہ آئندہ انتخابات میں آپ ہمارے ساتھ ہوں" سیاستداں نے کہا۔ پھر لائن کٹ گئی۔

کچھ ایسی ہی باتیں دوسری سیاسی جماعت کے نمائندے نے کہیں۔ پھر اخباری رپورٹر آگئے اور اس سے کرید کرید کے وہ سوالات کرنے لگے جو اُن کے نزدیک ایک اچھے انٹرویو کی بنیاد تھے۔ پروفیسر نے تسلیم کیا کہ وہ موجودہ حکومت کی غلط پالیسی کے بارے میں طلبا کو ضرور بتاتا رہا ہے مگر... اس کا جواب پورا ہونے سے پہلے ہی دوسرا سوال داغ دیا گیا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلی بہت ضروری ہے؟"

"جی ہاں۔ انتخابات آخر ہوتے کس لیے ہیں..."

"کیا آپ آئندہ انتخابات میں ملک صاحب کے خلاف کھڑے ہوں گے؟"

"سنا ہے کل وہ آپ سے ذاتی طور پر درخواست کرنے آئے تھے کہ اس حلقے میں آپ ان کی مخالفت نہ کریں؟"

"کیا انھوں نے آپ کو الیکشن سے دستبرداری پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی پیشکش کی تھی؟"

"کیا وہ حکومت کی طرف سے کوئی مذاکرات کی پیش کش لے کر آئے تھے؟"

پروفیسر صداقت پے در پے سوالات سے بوکھلا گیا۔ اس نے ہر سوال کا جواب اپنی عقل اور سیاسی سمجھ بوجھ کے مطابق دیا لیکن وہ اگلے دن کے اخبارات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے بیان کو یوں توڑ مروڑ کے شائع کیا گیا تھا کہ یہ حزب اختلاف کے کسی لیڈر کا بیان لگتا تھا۔ جملوں کو سیاق و سباق سے الگ کر دیا گیا تھا۔ جو باتیں اس نے نہیں کہی تھیں، وہ اس سے منسوب کر دی گئی تھیں۔ شام کے ایک اخبار نے حد یہ کی تھی کہ ملک صاحب کو ان کی زبانی ایک بدعنوان، ناقابلِ اعتبار اور نااہل شخص قرار دلوا دیا گیا تھا۔ جو کسی طرح بھی اس قوم کا نمائندہ بننے کا اہل نہیں تھا۔ اس میں یہ بھی تھا کہ ملک صاحب نے انھیں دس لاکھ روپے دے کر انتخابات میں حصّہ نہ لینے پر مجبور کرنا چاہا تھا مگر پروفیسر صداقت نے ان کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ نہ وہ بکنے والے ہیں اور نہ جھکنے والے۔ وہ آئندہ انتخاب میں کس پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے، یہ فیصلہ ابھی انھوں نے نہیں کیا تھا۔

شام کو جب وہ سر پکڑے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کس کس کو تردید جاری کریں اور کس کس کو ہتکِ عزت کا نوٹس دیں کہ پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اتنے عاجز آچکے تھے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو ریسیور اٹھانے کے لیے کہا۔

چند سیکنڈ بعد شاہینہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ملک صاحب ہیں۔ لو بات کرو۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی پروفیسر صداقت نے ریسیور لے لیا۔

"اب کیا بات ہے ملک صاحب؟ اگر آپ ان اخبار والوں کی بات پر یقین کر چکے ہیں تو آپ کی مرضی۔"

ملک نے قہقہہ لگایا "یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ تو نہیں، انھوں نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا۔"

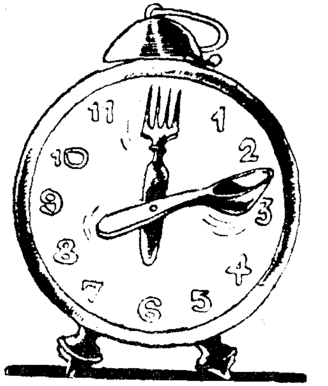
پروفیسر صداقت دم بخود رہ گئے "وہ... آپ کے بھیجے ہوئے لوگ تھے؟"

"بیانات بھی میرے اشارے پر دیے گئے تھے تمھیں ٹیلی فون بھی میں نے کروائے تھے۔ وہ سب ٹیپ کیا جا چکا ہے جو تم نے کہا۔ اخبار میں شائع ہونے والے بیانات کے بعد تم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ تم اب سرکاری ملازمت کیا کسی تعلیمی ادارے میں نوکری کے لیے نااہل ہو گئے ہو۔"

"میں تردید جاری کروں گا۔ ایک ایک کو عدالت میں کھینچ لوں گا۔ جنھوں نے یہ سازش کی..."

"کوشش کر کے دیکھو۔ کون چھاپتا ہے تمھاری تردید اور کون آتا ہے سمّن کے جواب میں۔" ملک نے فون بند کر دیا۔

اپنی کم مائیگی کا احساس پروفیسر صداقت کو اگلے ہی دن ہو گیا۔ انھوں نے فرداً فرداً ہر اخبار کو اس بیان کی تردید ارسال



کی جو اُن سے منسوب کر دیا گیا تھا اور جس کا نصف حصّہ ایسی باتوں پر مشتمل تھا جو انھوں نے بالکل نہیں کی تھیں۔ تاہم بقیہ نصف حصّے میں انھوں نے حکومت کے غیر جمہوری اقدامات اور طرزِ عمل پر کھل کے تنقید کی تھی۔ وہ سوالات ہی ایسے تھے کہ پروفیسر صداقت کے لیے جھوٹ یا منافقت سے کام لینا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ مخالفت برائے مخالفت کے قائل نہ تھے لیکن غلط کو غلط ضرور کہتے تھے۔ چونکہ وہ سب حکومت کے مخالف اخبار تھے۔ چنانچہ ان کے انٹرویو کا وہ حصّہ حذف ہو گیا تھا جس میں انھوں نے کچھ اچھے اقدامات کی تعریف کی تھی لیکن وہ حصّہ بہت نمایاں طور پر شائع ہوا تھا جس سے مخالفین کے موقف کو تائید و حمایت حاصل ہوتی تھی۔

پروفیسر صداقت کا وضاحتی بیان کسی نے شائع نہیں کیا، جان بوجھ کے ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور ان کے لیے ذہنی اذیّت کے اسباب پیدا کرنے کا قانونی نوٹس وہ کسی کو جاری نہ کرا سکے۔ وکیل کی فیس، عدالتی اخراجات اور مقدمات کی طوالت کے احساس نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ صبر کریں۔

اگلے چند دن میں متعدد واقعات پیش آئے۔ ایک صبح اچانک ان کا فون بند ہو گیا۔ شکایت کرنے پر انھیں بتایا گیا کہ واجبات ادا نہ کرنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔

"مجھے تو گزشتہ ماہ بل بھی موصول نہیں ہوا تھا" انھوں نے کہا۔

"ہر بل پر صاف لکھا ہوتا ہے کہ عدم ادائیگی پر یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ بل کی ڈپلی کیٹ کاپی لینا آپ کا فرض تھا" اکاؤنٹس آفیسر نے کہا۔

"چلیے مجھے بل بنا دیجیے" پروفیسر صداقت نے کہا "ڈیڑھ دو سو روپے میں ابھی ادا کر دیتا ہوں۔"

"آپ کا گزشتہ بل سات ہزار نو سو بائیس روپے تھا" اکاؤنٹس آفیسر نے بتایا۔

"سات ہزار نو سو۔ اتنا تو کبھی میرا ایک سال کا بل نہیں ہوا۔"

پروفیسر صداقت نے احتجاج کیا۔

"اور یہ اس ماہ کا بل ہے۔ بائیس ہزار آٹھ سو بیس روپے۔" اکاؤنٹس آفیسر نے کہا۔ "آپ تیس ہزار سات سو بیالیس روپے جمع کرا دیجیے۔"

پروفیسر صداقت کے چیخنے چلّانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ قواعد و ضوابط کی رُو سے یہ ضروری تھا کہ وہ پہلے ادائیگی کریں اور اس کے بعد معمول سے زیادہ بل کی شکایت کریں جو نظرِ ثانی کی درخواستوں پر غور کرنے والی کمیٹی کے سامنے آئندہ میٹنگ میں پیش کر دی جائے گی۔

اکاؤنٹس آفیسر نیک آدمی تھا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "پروفیسر صاحب! یہ سب کچھ اوپر سے ملنے والے احکامات کے مطابق ہو رہا ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس ملک میں مخالفین سے نمٹنے کی روایات ایسی ہی ہیں۔"

"لیکن میں تو حکومت کے مخالفین میں شامل نہیں۔"

"اب تو ہو گئے ہیں نا۔ معاف کیجیے گا آپ جیسے سمجھدار اور حالات پر نظر رکھنے والے شخص سے ایسے طرزِ عمل کی توقع نہیں کی جاتی۔ میرا بیٹا بھی آپ ہی کے کالج میں ہے اور آپ کی بہت تعریف کرتا ہے مگر۔۔"

"ابھی تک میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"آپ ایک سرکاری ملازم ہیں۔ اخبارات میں حکومت کے خلاف بیان بازی کر کے آپ نے خود حکومت کو موقع فراہم کر دیا۔۔"

"یہ بیانات خود ساختہ اور من گھڑت ہیں۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کلاس میں بھی اکثر حکومت پر تنقید کرتے تھے اور حکومت سے زیادہ حکومت کے نااہل وزیروں کے خلاف بولتے تھے۔"

"کیا غلط کو غلط کہنا بھی جرم ہے؟"

"یہ جرم کب نہیں تھا پروفیسر صاحب۔ کس دور میں نہیں تھا۔ اور ایسا کوئی دور آئے گا بھی نہیں۔ جب آپ یا میں سرِعام سچ بولیں گے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے مگر میری ہمدردی آپ کے کسی کام نہیں آ سکتی۔ بلکہ آپ نے کسی کے سامنے میرے ہمدردانہ رویّے کا حوالہ بھی دیا تو میں آپ کو جھوٹا قرار دوں گا۔ مجھے یہ نوکری عزیز ہے۔ کیونکہ اب میری ریٹائرمنٹ میں صرف دو سال باقی ہیں۔" اکاؤنٹس آفیسر نے کہا۔

"آپ نے سچ بولا۔ اس کے لیے شکریہ۔ مجھے اب اندازہ ہو گیا ہے کہ آزاد ملک کے باشندے کہلانے والے اپنے نام پر کیسی کیسی تہمت برداشت کر رہے ہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔"

اسی دن انھیں وزارتِ تعلیم کی طرف سے انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا حکم نامہ ملا۔ شام کو انھیں ایک تقریب میں مدعو کیا گیا تھا جو "انجمنِ دانشورانِ ملّت" کے یومِ تاسیس پر منعقد ہو رہی تھی۔ پروفیسر صداقت علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے اور جب سے سیاسی فلسفے پر ان کی کتاب "جمہوریت کہاں ہے" کو ملکی و بین الاقوامی اعزازات ملے تھے، ایسے دعوت ناموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا جو کسی نہ کسی کے حقوق کا تحفظ کرنے والی انجمن کی جانب سے موصول ہوتے تھے۔

شام کی نشست میں انھیں مہمانِ خصوصی قرار دیا گیا اور وہ کرسیٔ صدارت پر حزبِ اختلاف کے ایک نامور سیاسی رہنما کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بیشتر مقرر بھی حکومت کے کٹر مخالفوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے رہے۔ پروفیسر صداقت بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتے رہے اور خفیہ پولیس کے ارکان کو خاموشی سے نوٹس لیتا دیکھتے رہے۔ اچانک پروفیسر صداقت ہیرو ہو گئے تھے۔ ان کی معطلی کو جمہوری جدوجہد کا سنگِ میل قرار دیا جا رہا تھا۔ مقرر دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ "اس ملک کے عوام، طلبا، کسان، دانشور سب بیدار ہو چکے ہیں۔" حاضرین نعرے لگا رہے تھے۔ "لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی۔"

پروفیسر صداقت بری طرح پھنس چکے تھے لیکن وہ واک آؤٹ نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ آج وہ سب کے سامنے صورتِ حال کی پوری وضاحت کر دیں گے۔ ان کی تقریر صدر کے خطاب کے بعد رکھی گئی تھی۔ صدرِ جلسہ نے ایسی آتش فشاں تقریر کی کہ پروفیسر صداقت کے پسینے چھوٹ گئے۔ یہ دانشورانِ ملّت کا نہیں محض حکومت کے مخالفین کا اجتماع تھا۔

پروفیسر صداقت کی باری آنے سے پہلے ہی جلسہ گاہ میں ہنگامہ ہو گیا۔ کسی نے باہر سے گزرتے گزرتے ایک پٹاخا پھینک دیا جو پنڈال کے وسط میں آ کے پھٹا۔ اس سے بھگدڑ مچی۔ نہ جانے کس نے کرسیاں پھینکنے کا سلسلہ شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے جلسہ گاہ میدانِ کارزار کا نقشہ پیش کرنے لگی۔ پھر کسی نے تار کاٹ دیے۔ اندھیرا پھیلتے ہی افراتفری پھیل گئی۔

پروفیسر صداقت نے اسٹیج پر سے چھلانگ لگائی۔ عقبی حصّے میں لگی ہوئی قنات کے ساتھ دیوار تھی۔ وہ دیوار پر گرے اور اٹھ کر بھاگنے ہی والے تھے کہ انھیں گھسیٹ کر ایک گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ ان کے ساتھ یہ زبردستی کرنے والے تین چار ہٹے کٹے نوجوان تھے۔

جب گاڑی روانہ ہو گئی تو پروفیسر صداقت نے کہا۔ "تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ہم آپ کے خیر خواہ ہیں سر۔" ایک لڑکے نے کہا۔ "اگر ہم آپ کو نکال کے نہ لاتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔"

"یہ سب گڑبڑ حکومت کے ایما پر کرائی گئی تھی۔" دوسرے نے کہا۔

"وہ سب سرکاری غنڈے تھے۔" تیسرے نے کہا۔ "ان کے وہاں آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ جلسہ درہم برہم کیا جائے اور اہم سیاسی رہنماؤں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے۔"

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے گولی مارنے سے حکومت کو کیا حاصل ہو گا؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"آپ کے ساتھ حزبِ اختلاف کے اتنے اہم لیڈر بھی تھے۔ ان کی موت سے پورے ملک میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا، ہنگامے شروع ہوتے ہی حکومت کو انتخابات ملتوی کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا۔" پہلے نے کہا۔

"یہ تم کدھر جا رہے ہو؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "یہ میرے گھر کا راستہ تو نہیں ہے۔"

"آپ اس وقت گھر گئے تو راتوں رات اٹھا لیے جائیں گے، سی آئی اے والے آپ کو غائب کر دیں گے اور شاہی قلعے میں پہنچا دیں گے۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

"میں گرفتاری سے نہیں ڈرتا لیکن ایسے روپوش ہو کے تو میں خود کو مجرم بنا لوں گا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "گھر پر میری بیوی اکیلی ہے۔"

"اب ایسی دھاندلی بھی نہیں ہے سر کہ کوئی آپ کی جگہ آپ کے بیوی بچوں کو پکڑے۔ ایسا تو پولیس اشتہاری مجرموں اور ڈاکوؤں کے اہلِ خانہ کے ساتھ بھی نہیں کرتی۔"

"لیکن میں گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"کل تک حالات سازگار ہو جائیں گے۔ آپ کی طرف سے عدالت میں ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دائر کر دی جائے گی۔ پھر کوئی آپ پر ایسے ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔"

پروفیسر صداقت نے بادلِ ناخواستہ وہ رات ایک سیاسی رہنما کے گھر پر گزاری جو حکومت کے مخالفین میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے پروفیسر صداقت کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان کی "صداقت و انصاف پارٹی" میں شامل ہو جائیں تو ان کو اسی حلقۂ انتخاب سے ٹکٹ دیا جا سکتا ہے جہاں سے ملک امیدوار ہو گا لیکن پروفیسر صداقت نے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا علمی سیاست سے کیا تعلق۔ میں پڑھنے پڑھانے والا آدمی ہوں۔

صبح کے اخبارات نے پروفیسر صداقت کی قسمت بدلنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سب اخبارات میں پروفیسر صداقت کی روپوشی کی خبر نمایاں تھی۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ پولیس نے ان کی تلاش میں کئی جگہ چھاپے مارے اور ان کے بیوی بچوں کو ہراساں کیا۔ اخبارات میں وہ تقریر بھی تھی جو انھوں نے نہیں کی تھی۔ اس میں حکومت پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی اور ان غیر جمہوری ہتھکنڈوں کی مذمت کی گئی تھی جو حکومت مخالفین کے جمہوری حقوق کی جدوجہد اور صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ اس میں صاف ذکر تھا کہ حکومت نے ان کا فون کاٹ دیا ہے۔ ان کو سنگین مقدمات میں ملوّث کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے اور ان کے خاندان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ مگر وہ اس حکومت کے اوچھے ہتھکنڈوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعد میں یہ سب ہوا۔ پروفیسر صداقت کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ان پر حکومت کے خلاف منافرت پھیلانے کا مقدمہ درج ہوا۔ پھر تحفظِ امنِ عامّہ کے تحت ان کو حراست میں لیا گیا۔ "جمہوری حقوق پارٹی" کے ایک رہنما نے جو ایک نامور وکیل تھا۔ ان کی ضمانت پر رہائی کرا دی۔ اس وکیل نے انھیں اپنی جماعت کے کنونشن میں شرکت کی دعوت بھی دی جسے انھوں نے اخلاقاً قبول کر لیا۔ ان کو کچھ اندازہ پہلے سے تھا کہ "صداقت و انصاف پارٹی" کے مقابلے میں "جمہوری حقوق پارٹی" کو زیادہ لوگوں کی تائید اور

حمایت حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی تنظیم تھی۔ وہ اپنی انتخابی مہم کو بڑے پُرامن اور منظم طریقے پر چلا رہے تھے۔ پھر ان کے ساتھ زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو موجودہ حکومت کے دور میں ہر قسم کی ناانصافی اور ظلم کا شکار ہوئے تھے۔ پروفیسر صداقت ان سب سے واقف تھے کیونکہ وہ اخباری کیڑے تھے اور ہر روز کم سے کم چار اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔ دو اردو کے اور دو انگریزی کے جن میں ایک شام کا اخبار بھی شامل تھا۔ اس سے انہیں بیک وقت حکومت کی کارکردگی اور غلط روی کے علاوہ حزبِ اختلاف کا مؤقف معلوم ہوتا رہتا تھا اور وہ تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کے لیے "بین السطور" پڑھ کے اپنی رائے قائم کرتے تھے۔ "جمہوری حقوق پارٹی" واضح طور پر مظلوموں کی جماعت تھی جو اس لیے اکٹھے ہوگئے تھے کہ انتخابات سے پہلے عوام تک اپنی آواز پہنچا کے اپنے لیے ان کی ہمدردی حاصل کرلیں، حکومت نے کس کے ساتھ کیا کیا، یہ لوگ بھی جانتے تھے چنانچہ جے ایچ پی (جمہوری حقوق پارٹی) کو قدرتی طور پر مظلوموں کی آواز سمجھا جاتا تھا اور یہ تاثر بھی عام تھا کہ دوسری جماعتوں کے مقابلے میں جے ایچ پی کا منشور قومی و ملکی حالات کے تقاضوں کی صحیح عکاسی کرتا ہے چنانچہ جے ایچ پی کے برسرِاقتدار آنے کی صورت میں وہ سب نہیں ہوگا جو اب ہو رہا تھا۔

پروفیسر صداقت خود بھی مظلوم تھے یا بنا دیے گئے تھے، ہر صورت میں وہ بھی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کسی سہارے کے طلبگار تھے اور تبدیلی کے بغیر بہتری کی امید نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جب انھیں جے ایچ پی کی طرف سے باقاعدہ پیش کش کی گئی تو انھوں نے رکنیت کے فارم پر دستخط کردیے۔ اگلے دن کے اخبارات نے صداقت یار کی جمہوری حقوق پارٹی میں شمولیت کی خبر نمایاں طور پر شائع کی۔ ان کے فیصلے کا جے ایچ پی کے مقتدر رہنماؤں کی جانب سے خیر مقدم کیا گیا تھا اور اسے جمہوریت کی جدوجہد کرنے والوں کی ایک اور کامیابی قرار دیا گیا تھا جس سے حکومتی ایوانوں میں لرزہ پیدا ہوگیا تھا۔

سیاسی میدان میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگائے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ صداقت یار نے جب انتخابی جلسوں اور کارنر میٹنگوں سے خطاب کرنا شروع کیا تو ان کا اندازِ بیاں خود بخود پیشہ ورانہ سیاست کی طرح ہوگیا۔ وہ ایک کامیاب لیکچرر تھے، ان کے پاس علم تھا اور انھیں اظہار کے اسلوب پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک شعلہ بیاں مقرر سمجھے جانے لگے اور رفتہ رفتہ یہ بھولنے لگے کہ وہ صرف سیاسیات کے پروفیسر تھے۔ جب ہزاروں اور پھر لاکھوں کا مجمع ان کی تقریروں کے دوران میں زندہ باد کے نعرے لگانے لگا اور ان پر ہر جلوس میں گل پاشی ہونے لگی تو انھیں احساس ہوا کہ اب تک انھیں اپنی صلاحیت کو آزمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ انھوں نے تھوڑی سی عزت و شہرت کو بہت سمجھ لیا تھا اور کلاس روم تک محدود ہوکے اپنا وقت ضائع کیا تھا۔ وہ ایک کامیاب سیاسی لیڈر بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا تھا کہ اس وقت ملک کو انھی جیسے لیڈروں کی ضرورت تھی جو سیاست کے ساتھ ملکی حالات کو بھی سمجھتے تھے چنانچہ قوم کی صحیح سمت میں رہنمائی کرسکتے تھے۔ خود مظلوم تھے اس لیے اقتدار میں آنے کے بعد ظلم نہیں کرسکتے تھے۔

حکومت کی طرف سے ابتدا میں انھیں جو مصالحت کی پیشکش کی گئی تھی۔ وہ انتہائی ذلت آمیز شرائط پر مبنی تھی، مثلاً ان سے اپنے سابقہ رویّے پر معافی مانگنے اور آئندہ کے لیے نیک چلنی کی ضمانت فراہم کرنے کو کہا گیا تھا۔ تعاون کی صورت میں ان کے خلاف درج کیے جانے والے مقدمات واپس لینے کے علاوہ انھیں وزارتِ تعلیم میں اعلا عہدے پر فائز کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا مگر پروفیسر صداقت نے ایسی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے بعد انتقامی کارروائی کا سلسلہ دراز ہوگیا تھا اور اب خود انھیں بھی معلوم نہ تھا کہ ان کے خلاف کہاں کہاں کس جرم میں پرچے کاٹے جاچکے ہیں۔ ایک کیس میں انھوں نے چھ ماہ کی جیل بھی کاٹی تھی لیکن جیل میں وہ سیاسی قیدی کا درجہ رکھتے تھے۔ انھیں اے کلاس دی گئی تھی اور کسی قسم کی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ جے ایچ پی کی حمایت عملاً بھی جاری رہی تھی۔ ان کی غیر حاضری میں پارٹی فنڈ سے ان کے گھر پر باقاعدہ رقم پہنچتی تھی۔ ان کے حق میں بیانات اور احتجاجی مظاہرے جاری رہے تھے اور ان کے ملاقاتیوں کے ملنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ چھ ماہ کی جیل کاٹ کے نکلے تو سکّہ بند لیڈر تھے۔

انتخابات میں اب بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ جلسوں میں حاضرین کی تعداد اور ان کا جوش و خروش دیکھ کے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ جے ایچ پی واضح اکثریت سے کامیاب ہوگی۔ بہت سے لیڈر اپنی پارٹی کو چھوڑ کے جے ایچ پی میں شامل ہونے لگے تھے اور ملک کے ہر حصے سے ملنے والی خبریں بہت حوصلہ افزا تھیں۔ آہستہ آہستہ حکومتی پارٹی کے ارکان نے بھی حیلے بہانوں سے جے ایچ پی کا رخ کیا اور عوامی اجتماعات میں حکومت پر تنقید کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔ پروفیسر صداقت نے ایسے لوگوں کی پارٹی میں آمد پر اعتراض کیا تو ان کو یہ دلیل دی گئی کہ ہمارا مقصد تبدیلی ہے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی حمایت درکار ہے۔ بلاشبہ بعد میں جب حکومت تشکیل دی جائے گی تو ایسے ابن الوقت قسم کے لوگوں کو مایوسی ہوگی پروفیسر صداقت سے یہ بھی کہا گیا کہ قبل از وقت غلطی کا احساس ہو جائے تو ایسے شخص کو اپنی اصلاح کے لیے موقع ضرور ملنا چاہیے جس کا

بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا کون کہتا ہے۔ جے ایچ پی کی مجموعی قوت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

پروفیسر صداقت کو حقیقی صدمہ اس دن اٹھانا پڑا جب ان کو ذلّت و رسوائی اور تباہی کے راستے پر دھکیلنے والے ملک صاحب نے بھی "جمہوری حقوق پارٹی" میں شرکت اختیار کرلی۔ ان کا بھی پارٹی میں اسی طرح خیر مقدم کیا گیا جیسے پروفیسر صداقت کا ہوا تھا۔

اس اعلان کے بعد ملک صاحب نے پروفیسر صداقت سے ملاقات کی کوشش کی مگر انھوں نے اس سے ہاتھ ملانے سے بھی انکار کردیا۔

"اب تو ہم اور آپ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔" ملک نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ڈوب جائے گی وہ کشتی، جس میں تم قدم رکھو گے۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "تم وقت کے ساتھ چولا بدل رہے ہو مگر تم مجھے بے وقوف نہیں بناسکتے۔ میں تمھاری رگ رگ سے واقف ہوں۔"

"چلیے اب چھوڑیے پرانی باتوں کو۔" ملک نے کہا۔ "جو ہونا تھا ہوگیا...."

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا نالائق بیٹا اشرف بی اے ہی نہیں۔ سی ایس پی کا امتحان بھی پاس کرچکا ہے۔"

"اب تو ٹریننگ بھی پوری ہوچکی اس کی۔ اللہ نے چاہا تو اپنے ہی علاقے میں اسسٹنٹ کمشنر لگے گا۔"

"اللہ کو اپنے گناہوں میں کیوں شریک کرتے ہو ملک، وہ کسی نالائق کو سادہ امتحانی کاپی میں نمبر نہیں دلواتا۔ اسے کیا کہ کسی سی ایس پی افسر کی پوسٹنگ کہاں ہوتی ہے۔ یہ تم جیسے لوگوں کے دھندے ہیں۔ تم کو اب فکر ہوگی اپنی شوگر ملوں کی، اپنے کالے دھن کی اور احتساب کی۔ تم ایک کرپٹ انتظامیہ کے پروردہ...."

"پروفیسر صاحب! انتخابات کے بعد حکومت ہی تو بدلے گی، انتظامیہ وہی ہوگی۔" ملک نے کہا۔

"انتظامیہ پر حکومت کی سخت گرفت ہو تو کوئی کیسے بچ سکتا ہے۔ تم جیسے انکم ٹیکس چور۔ ملکی خزانہ لُوٹ کے اپنے خزانے بھرنے والے...."

"تم تقریریں اچھی کرلیتے ہو۔ میں نے سنی ہیں۔" ملک نے کہا۔ "مگر پروفیسر۔ یہ مت بھولو کہ تم کو لیڈر بنانے والا میں ہی تھا۔ میری وجہ سے آج اتنا بول لیتے ہو ورنہ تمھارا لیکچر ایک کلاس کے لڑکوں کے سوا کون سنتا تھا۔"

پروفیسر صداقت نے اسی دن جے ایچ پی کو اپنا احتجاج ارسال کردیا۔ اس میں صاف کہا گیا تھا کہ انتخابات جیتنے کے لیے اب تک پارٹی نے جن لوگوں کا تعاون حاصل کیا ہے، وہ پارٹی کے مخلص کارکنوں کے لیے باعثِ تشویش ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار کی منزل تک پہنچنے کے لیے پارٹی کی قیادت نے کھوٹے کھرے کی تمیز بھی کھودی ہے۔ ملک جیسے لوگوں کی موجودگی نے میرے لیے شک کی قطعی گنجائش نہیں چھوڑی کہ اب پارٹی اپنے منشور اور اصولوں سے انحراف کے راستے پر چل پڑی ہے۔

اس احتجاج کی ایک نقل اخبارات کو بھی فراہم کردی گئی۔ چنانچہ صبح حکومت کے ترجمان اخبارات نے جے ایچ پی میں پھوٹ کی خبر کو خوب اُچھالا۔ جے ایچ پی کے صدر نے جواب میں کہا کہ یہ سرکاری پروپیگنڈا ہے۔ چونکہ ہم ایک جمہوری پارٹی ہیں۔ اس لیے ہمارے ارکان کو اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے اور وہ آزادی سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ تاہم اس سے پارٹی کے اتحاد میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پروفیسر صداقت کو اسی دن مذاکرات کے لیے طلب کرلیا گیا۔ وہ پارٹی کے صدر اور سیکریٹری جنرل سے دوٹوک بات کرنا چاہتے تھے۔ جب سیاہ شیشوں والی ایک شاندار مرسیڈیز انھیں لینے آئی تو شاہینہ کا چہرہ مسرّت سے دمکنے لگا۔

"ایک دن تم ایسی ہی گاڑی میں جھنڈا لگا کے پھرو گے۔"

"صرف میں۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "تم بھی تو وزیرِ تعلیم مسز صداقت بن کے پھرو گی۔ فلاں کالج کے مینا بازار کی مہمانِ خصوصی۔ فلاں رفاہی انجمن کی اعزازی صدر۔ فوٹو گرافر آگے پیچھے اور ہر جگہ پھولوں کے ہار۔ کسی غیر ملکی مہمانوں کے استقبال کے لیے ائیرپورٹ پر موجود ...."

شاہینہ ان تصوّرات میں کھوگئی جو ٹی وی کے خبرناموں کا عکس تھے۔ وزیروں کی بیگمات کیا ہوتی ہیں اور کیا کرتی ہیں، یہ سب وہ ہر روز دیکھتی تھی۔ ایسا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ خود بھی ...

"آج میں فیصلہ کرکے ہی آؤں گا۔" پروفیسر صداقت نے شیروانی پہننے کے بعد کہا۔ "میری جناح کیپ دینا۔"

"کیسا فیصلہ؟" شاہینہ کے خیالات کی رَو ٹوٹ گئی۔

"یہی کہ پارٹی میں یا ملک رہے گا یا میں رہوں گا۔"

"اور اگر انھوں نے تمھاری یہ شرط تسلیم نہ کی پھر؟" شاہینہ نے ان کو جناح کیپ تھما کے کہا۔

"میں پارٹی سے الگ ہوجاؤں گا۔" پروفیسر صداقت نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

"پارٹی چھوڑ دو گے؟ اس وقت؟" شاہینہ کے خواب بکھرنے لگے۔ "جب کہ انتخابات سر پر ہیں اور جے ایچ پی کی کامیابی یقینی ہوگئی ہے۔ یہ تو بڑی احسان فراموشی .."

پروفیسر صداقت نے حیرانی سے شاہینہ کو دیکھا۔

"شانی۔ یہ تم کہہ رہی ہو! میں احسان فراموش ہوں؟"

"اور نہیں تو کیا۔" شاہینہ نے ہمّت کرکے کہا۔ "آج تم جو کچھ بھی ہو جے ایچ پی کی وجہ سے ہو۔ پارٹی نے تم کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ جہاں تم خود کو سیاسی لیڈروں میں شمار کرنے لگے ہو۔"

"اُونہہ۔ یہ میری خداداد صلاحیّت اور قابلیّت تھی جس سے پارٹی نے پورا فائدہ اٹھایا۔ میں فائدہ اٹھانا چاہتا تو حکومت سے سودا کرسکتا تھا اور اب بھی کیا ہے۔ صداقت انصاف پارٹی میں میرے لیے ہر وقت جگہ ہے۔"

"مگر صداقت و انصاف پارٹی اتنے ووٹ نہیں لے سکتی.."

"مجھے معلوم ہے کہ ابھی جلسے جلوس دیکھ کر جمہوری حقوق پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کا ہی زیادہ امکان نظر آتا ہے لیکن ووٹر کے ذہن کا کچھ پتا نہیں کب پلٹ جائے۔ پولنگ بوتھ میں وہ اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ صداقت و انصاف پارٹی کی پوزیشن بھی کمزور نہیں ہے۔ وہ ایک مضبوط حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرسکتی ہے۔"

"اور تم۔ تمھیں حزبِ اختلاف میں بیٹھنا منظور ہوگا؟" شاہینہ نے مایوسی سے کہا۔ وزیر کی بیگم کی حیثیت سے چند منٹ پہلے اس نے جو حسین خواب دیکھے تھے، کیا وہ ادھورے رہ جائیں گے؟

"جمہوریت میں دونوں ضروری ہیں۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "اگر حزبِ اختلاف نہ ہو تو پھر جمہوریت بھی آمریت میں ڈھل جاتی ہے۔"

اپنی بیوی کو دل گرفتہ چھوڑ کے وہ کار میں بیٹھ گئے، شاہینہ کا اداس چہرہ ان کی قوّتِ مزاحمت پر اثرانداز ہونے لگا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اپنے سخت مؤقف میں کچھ لچک پیدا کرنا اس مرحلے پر پارٹی بدلنے سے یقیناً بہتر رہے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے درمیان کی راہ نکال لی۔

"جے ایچ پی کے صدر نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہاں مجلسِ عاملہ کے ارکان، نائب صدر اور جنرل سیکریٹری سب ہی موجود تھے۔ پروفیسر صداقت نے محسوس کیا کہ ماحول قدرے کشیدہ ہے۔ مجلسِ عاملہ کے اراکین کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ صدر، نائب صدر اور جنرل سیکریٹری اپنی مایوسی کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے باوجود اجلاس کی رسمی کارروائی شروع نہیں ہوئی تو پروفیسر صداقت نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

"وہ... دراصل ایک مہمان کا انتظار ہے۔" پارٹی کے صدر نے کہا۔ "ایک غیر ملکی مہمان کا۔"

"کیا وہ بی بی سی کا نمائندہ ہے؟" پروفیسر صداقت نے حیران ہوکے کہا۔

"نہیں۔ مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں صحافی مدعو نہیں کیے جاتے۔" نائب صدر نے کہا۔ اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"وہ عام مہمان نہیں ہے۔" جنرل سیکریٹری نے کہا۔ "وی وی وی آئی پی ہے۔ وی وی آئی پی تو سنا ہوگا آپ نے؟"

"چار وی۔ جیسے چار ستاروں والا جنرل یا تین ستاروں والا، دو ستاروں والا۔ ایسے ہی . . ."

اس کی بات مہمان کے آنے سے ادھوری رہ گئی۔ پروفیسر صداقت اسے وہاں دیکھ کے بھونچکّا رہ گیا۔ اس نے مختصر بات کی اور کہا کہ "جے ایچ پی" کی کامیابی بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے تمام فنڈ اور انتخابی مشینری ایک سُپر پاور کی طرف سے فراہم کردی گئی ہے چنانچہ پارٹی کو اپنی شیڈو کابینہ بنا کے اقتدار سنبھالنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس نے جمہوری حقوق پارٹی کے بارے میں خفیہ تحقیقاتی اداروں کی رپورٹ بھی پیش کی اور بتایا کہ گزشتہ پندرہ دن میں انھوں نے رائے عامّہ کو خاصا ہموار کرلیا ہے لیکن ان کی کامیابی کا ذرا بھی اندیشہ ہوا تو انتخابات ملتوی کرا دیے جائیں گے اور اس کے لیے ایک الگ پلان ہے تاہم اس مرحلے پر پارٹی میں کسی قسم کا انتشار پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

پروفیسر صداقت نے محسوس کیا کہ "وی وی وی وی آئی پی" نے آخری بات بطورِ خاص اسے مخاطب کرکے کہی تھی۔ اس کے جاتے ہی پارٹی کی مجلسِ عاملہ کے ارکان بڑے جوش و خروش سے گلے ملنے لگے اور ایک دوسرے کو یوں مبارکباد دینے لگے جیسے وہ انتخابات جیت چکے ہوں۔ انھوں نے پروفیسر صداقت

فنونِ لطیفہ

ایک بار کسی ادیب نے مجاز سے کہا۔

"مجاز صاحب! ادھر آپ نے شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کردیے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی مشاعرے میں شعر سنانے کے لیے کھڑے ہوں تو لوگ کہیں، شعر نہیں اپنے لطیفے سنائیے۔"

"تو میں ان سے کہوں گا۔" مجاز نے سادگی سے کہا۔ "شاعری بھی تو فنونِ لطیفہ میں سے ہے۔"

کی اصولی بات بھی بڑے تحمل سے سنی اور یہ شرط بھی قبول کرلی کہ ملک کو پارٹی کی طرف سے ٹکٹ نہیں دیا جائے گا۔ پروفیسر صداقت نے اپنے مطالبے کو اس حد تک نرم کرلیا تھا کہ ملک کو پارٹی سے نکالنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اس کے لیے یہی یقین دہانی کافی تھی کہ ملک جیسے لوگوں کے دوبارہ برسرِاقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں۔

وہ جب واپس لوٹا تو جے ایچ پی کے ساتھ اپنی کامیابی کے احساس سے اتنا خوش تھا کہ شاہینہ کو شانی کہنے کے بجائے مسز وزیرِ تعلیم کہتا رہا اور پھر رات گئے تک محکمۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم میں ممکنہ ضروری اصلاحات کا شیڈول مرتب کرتا رہا اور فوری توجہ طلب امور کی ترجیحات کا تعین کرتا رہا۔

انتخابات کے لیے پارٹی ٹکٹ ملنے تک پروفیسر صداقت نے بھی جے ایچ پی کے لیے کنویسنگ میں اپنا سارا زورِ بیان اور زورِ خطابت صرف کردیا۔ وہ ایک شعلہ بیاں مقرر تھا اور خطابت کے جوش میں وہ الفاظ و معانی کا ایک ایسا دریا بن جاتا تھا جس میں سامعین کے جذبات تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔ ملک صاحب کو صداقت نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ وہ بھی جے ایچ پی کے حق میں جلسے کر رہے تھے اور عموماً ان کو مشترکہ جلسوں سے بھی خطاب کرنا ہوتا تھا۔

بجلی صداقت یار پر آخری وقت میں گری جب پارٹی نے امیدواروں سے درخواستیں طلب کرنے کے بعد ملک صاحب کو اس حلقے سے امیدوار نامزد کردیا۔ پروفیسر صداقت کے لیے اس تلخ حقیقت کو قبول کرنا مشکل تھا۔ انھوں نے پارٹی کی قیادت سے احتجاج کیا تو انھیں بتایا گیا کہ یہ فیصلہ ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں کیا گیا ہے۔

"ملک و قوم کا وسیع تر مفاد اس شخص سے وابستہ ہے جس نے ملک و قوم کو بیچ کھایا تھا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "جس کے پاس ابتدا میں صرف گنّے کا رس نکالنے کی ایک مشین تھی۔ وہ آج مالک ہے دو شوگر ملز کا۔"

"ذاتی محنت، صلاحیت اور لگن سے بہت سے لوگوں نے بے مثال ترقی کی ہے۔"

"لیکن وہ اس حکومت میں ہر منفعت بخش عہدے پر فائز رہا ہے۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "اس نے کروڑوں روپے کے سرکاری قرض لیے اور واپس نہیں کیے۔ اس نے ترقیاتی فنڈ سے ایک روپے کا کام کیا تو نو روپے اپنی جیب میں ڈالے آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ اپنے حلقۂ انتخاب میں لوگوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ اس کے غنڈوں نے . . ."

"صداقت صاحب۔ سیاست میں فرشتے کامیاب نہیں ہو سکتے اور انسان فرشتہ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"کیا یہی صلہ ہے میری قربانیوں کا اور میری خدمات کا۔ اپنا سب کچھ میں نے پارٹی کو دے دیا۔ میں جیل گیا، میں نے اپنا کیریئر تباہ کیا، حکومت سے ٹکر لینے کی سزا برداشت کی، انتخابی مہم میں دن رات ایک کردیے۔"

"پارٹی آپ کی خدمات کا اعتراف کرتی ہے۔"

"پھر ٹکٹ مجھے کیوں نہیں دیا گیا؟"

"اس کے لیے بہت سے عوامل کو سامنے رکھنا پڑتا ہے آپ انتخابی اخراجات کیسے پورے کریں گے؟ آپ کے پاس تو ایک جلسہ کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارے اخراجات ملک صاحب نے ہی کیے تھے جو لاکھوں تک پہنچتے ہیں۔ آئندہ کے اخراجات دس گنا ہوں گے۔ جلسے جلوس، گاڑیوں کا انتظام، پوسٹر بینر، ووٹروں سے رابطہ، ان کو لانے لے جانے، کھلانے پلانے کے اخراجات۔ ملک سے بہتر امیدوار کوئی نہیں ہوسکتا تھا . . ."

"ملک سے اس حلقے کے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ وہ جلسوں میں میری تقریریں سننے آتے تھے اور اس امید پر آتے تھے کہ اس بار میں منتخب ہوجاؤں گا تو ان کے سارے مسائل حل کردوں گا جو کبھی کسی امیدوار نے حل نہیں کیے۔ وعدے سب نے کیے تھے۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ اس فیصلے کو بدل دیں۔ ورنہ . . ."

"ورنہ کیا ہوگا۔ آپ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوجائیں گے۔ اپنا یہ شوق بھی پورا کرلیں۔ اگر اس ملک کا ووٹر باضمیر اور باشعور ہوتا تو یہاں کبھی کوئی ملک یا ان کا نمائندہ منتخب نہ ہو پاتا۔ مگر جیسی روح ویسے فرشتے۔ ملک کے پاس کارکن ہیں جو اسے کامیاب کرانا جانتے ہیں۔ ان کا مقابلہ آپ نہ کرسکیں گے۔ انھیں ووٹر بنانا، خریدنا توڑنا سب آتا ہے۔ ایک کارکن کی حیثیت سے پارٹی میں رہ کے آپ کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کرلیں گے۔ الگ ہوکے دھوبی کے کتّے ہوجائیں گے۔"

اس سے زیادہ تذلیل برداشت کرنا پروفیسر صداقت کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ احتجاجاً پارٹی چھوڑ آئے اور لوگوں کے سمجھانے کے باوجود انھوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے اپنے کاغذات جمع کرادیے ان کے لیے اب خوش آئند تصورات سے دستبردار ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی جو انھوں نے انتخابات میں اپنی کامیابی سے وابستہ کرلیے تھے اب وہ پروفیسر صداقت یار نہیں سیاستداں بن چکے تھے۔ ان کی منزل اسمبلی تھی اور پھر وزارت۔ اگر انھیں صرف اپنے عہدے پر بحالی مطلوب ہوتی تو وہ اتنے پاپڑ کیوں بیلتے۔ ان کے لیے حکومتِ وقت سے مفاہمت کا راستہ مختصر اور آسان تھا۔ انھوں نے ابتدا میں غیرسنجیدگی سے اپنے لیے وزیرِتعلیم بننے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اب ان کا

آسیب بن گیا تھا جس سے چھٹکارا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے تو اپنی وزارت کے دور میں اس پورے نظامِ تعلیم کو یکسر بدلنے اور اس میں انقلابی تبدیلی سے ان سب شکایات کو ختم کرنے کا پروگرام بھی مرتب کرلیا تھا جن کی نشاندہی دانشور، صحافی، ماہرینِ تعلیم اور عوام سب ہی کرتے رہتے تھے اور اس کام کے لیے اپنے محکمے کے اہل اور نااہل افسران کی الگ الگ فہرست بھی بنا چکے تھے۔

ٹکٹ نہ ملنے پر سب سے زیادہ آنسو شاہینہ نے بہائے۔ وزیرِتعلیم کی بیگم کی حیثیت سے اس کے تمام خواب چکنا چور ہوگئے تھے۔ جب تک میاں صرف لیکچرار اور دانشور تھے اس نے صبر و قناعت کا دامن تھامے رکھا تھا اور اسی زندگی کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کرلیا تھا جس میں صرف غربت تھی، کوٹھی، کار اور شان و شوکت کی زندگی کے لوازمات شجرِ ممنوعہ تھے۔ پروفیسر صداقت کی معطلی کے بعد حالات وقتی طور پر ابتری کا شکار ہوئے تھے مگر پھر اُمید کا نیا سفر شروع ہوا تو شاہینہ نے تسلیم کیا کہ اس خرابی میں بھی بہتری کے اسباب تھے۔ اس کے وہ ارمان پھر جاگ اٹھے جن کو اس نے تھپک کے سُلا دیا تھا اور وہ سب خواہشات پھر زندہ ہوگئیں جن کو اس نے قناعت کی لحد میں صبر کی مٹی ڈال کے دفن کردیا تھا۔

پروفیسر صداقت نے اسے دلاسا دیا کہ ناامیدی گناہ ہے اور ان کے حق میں یہ بہتر ہی ہوا کہ وہ کسی پارٹی کا احسان لیے بغیر منزل کے حصول کی جدّوجہد کریں۔ وہ بہت پُرعزم اور پُریقین تھے کہ اس علاقے میں جہاں بیشتر متوسّط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ رہتے تھے ان کے مقابلے میں ملک کی شکست یقینی تھی۔ اس حلقے کے ووٹر ملک کے قول و فعل کے تضاد کو سمجھتے تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ اور وہ جاہل یقیناً نہیں تھے۔

تاہم اپنے چند مخلص کارکنوں کی مدد سے انھوں نے جو پہلا جلسہ منعقد کیا وہ ناکافی تشہیر، بدنظمی اور کارکنوں کی ناتجربے کاری کے باعث ناکام ہوگیا۔ اخبارات میں ان کے خلاف "جے۔ ایچ۔ پی" کے لیڈر مسلسل بیانات دے رہے تھے اور ان کی کردارکشی کے لیے ان پر ہر قسم کے الزامات عائد کر رہے تھے، مثلاً یہ کہ پروفیسر صداقت نے اصولوں پر . . . سودے بازی کی کوشش میں ناکامی کے بعد "جمہوری حقوق پارٹی" سے علیحدگی اختیار کی تھی، وہ چاہتے تھے کہ پارٹی ان کو وزیرِتعلیم بنانے کی گارنٹی دے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ، حکومت کے ہاتھوں بک گئے ہیں اور ایک بدنام زمانہ وزیر کی معرفت انھوں نے بالواسطہ طور پر لاکھوں روپے وصول کیے ہیں۔

ایک رات وہ پہلے جلسے کی ناکامی پر دل شکستہ اور مایوس گھر لوٹ رہے تھے کہ انھیں چند غنڈوں نے گھیر لیا۔ ان کے چیخنے چلاّنے پر کوئی ان کی مدد کے لیے گھر سے باہر تک نہیں آیا اور غنڈے انھیں ایک گاڑی میں ڈال کے لے گئے۔ وہ ان میں سے کسی کو نہیں پہچانتے تھے ورنہ کہہ سکتے تھے کہ وہ ملک کے کارندے تھے۔ ایک ویران کوٹھی میں لے جاکر ان کو بڑی مہارت سے تشدّد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے جسم پر کسی چوٹ کا نشان چھوڑنے یا ان کی کوئی ہڈی توڑنے سے گریز کیا گیا مگر جسمانی ایذارسانی کے وہ سب طریقے آزمائے گئے جن کے بارے میں اب تک پروفیسر صداقت نے بہت کچھ سُنا اور پڑھا تھا۔ آدھی رات کے بعد وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں گھر پہنچے تو شاہینہ ان کی حالت دیکھ کر رونے پیٹنے لگی۔

"کس نے کیا ہے یہ سب آپ کے ساتھ . . .؟"

"انھوں نے جو نہیں چاہتے کہ میں اس حلقے سے منتخب ہوکے عوام کی خدمت ایمانداری سے کروں۔" انھوں نے بمشکل تمام کہا۔

"کیا وہ ملک کے آدمی تھے . . .؟"

"نہیں۔ میں اپنے حلقے کے لوگوں کو جانتا ہوں وہ "جے۔ ایچ۔ پی" کے غنڈے تھے۔" پروفیسر نے کراہتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے کہا ہے کہ میں کل تک اپنا نام واپس لے لوں ورنہ وہ میرے گھر کو آگ لگادیں گے، سب کو مار ڈالیں گے۔"

خوف سے شاہینہ کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ میں کسی کا نام نہیں لے سکتا اور کسی پر شک بھی ظاہر نہیں کرسکتا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"لیکن انھوں نے آپ کو دھمکی دی تھی۔"

"کیا پولیس بچاسکتی ہے مجھے۔ کسی بھی شہری کو، اگر وہ کہے کہ مجھے آج رات قتل کی دھمکی ملی ہے تو کیا کارروائی کریں گے وہ؟ ان کا کام تو قتل کے بعد شروع ہوتا ہے شانی۔"

"پھر کیا آپ . . .؟"

"نہیں شانی! ایسے حربے مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ ووٹر بھی مجبور ہیں۔ وہ ملک کی طاقت سے اور اس کی غنڈہ گردی سے ڈرتے ہیں۔ مگر ووٹ وہ اپنے ضمیر کے مطابق دیں گے۔ ملک ان کے ساتھ پولنگ بوتھ میں نہیں جاسکتا۔ تم اخبارات کے دفتر فون کرکے نمبر ملاؤ میں

خود بات کروں گا۔"

پروفیسر صداقت جانتے تھے کہ ان کا ایک بیان... "جے۔ایچ۔پی" کو اس مرحلے پر ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا مفصل بیان صبح کے اخبارات میں شائع ہو جائے۔ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کی بنیاد پر "جے۔ایچ۔پی" کی جمہوریت پسندی کے سارے دعووں کی قلعی کھول دیں اور عوام کے سامنے ان کا اصلی چہرہ آجائے۔ لیکن فون کو ڈیڈ پا کے انھیں تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ یہ مایوسی اس وقت غیظ و غضب میں ڈھل گئی جب انھوں نے اپنے گھر سے پول تک کا تار ہی غائب پایا۔

"گویا پورا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا انھوں نے۔"

پروفیسر صداقت نے دانت پیس کر کہا۔ "خیر، میں بھی نمٹ لوں گا سب سے۔ میں ایک پریس کانفرنس میں سب بتا دوں گا۔"

"اور اگر اس کے بعد بھی انھوں نے انتقامی کارروائی کی...؟"

"میں انتظامیہ سے کہوں گا۔" انھوں نے جوش سے کہا۔ مگر پھر اپنی بات پر خود ہی لاجواب ہو گئے۔ انتظامیہ کیا ہے کہاں ہے؟ کس کے ساتھ ہے؟ بیوروکریٹس کا وہ ٹولا جو ہر حکومت سے وفادار رہتا ہے اور ہر حکومت پر حاکم رہتا ہے، جو صرف اپنے مفادات کے ساتھ مخلص ہے، اسے کیا کہ بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا۔ اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے۔ انھیں یہی معلوم ہوگا کہ اس حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں اور آنے والے دنوں میں "جے ایچ پی" حکمراں جماعت ہوگی۔ وہ اپنی وفاداریاں بدل چکے ہوں گے، اس چلن کے ذمے دار وہی ہیں کہ ڈوبتے دن کی صدا غور سے سن، چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان۔

صبح کے اخبارات سے صورت حال مزید واضح ہو گئی۔ "جے ایچ پی" کے کچھ مقتدر رہنماؤں نے الزام لگایا تھا کہ گزشتہ رات صداقت یار کے غنڈوں نے "جے ایچ پی" کے امیدوار ملک پر حملہ کیا۔ انھیں زدوکوب کرنے کے بعد وہ ان کے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دے کر فرار ہو گئے تاہم اس واردات کی رپورٹ مقامی تھانے میں درج کرا دی گئی ہے۔ ملک صاحب کی حالت اسپتال میں بہتر بتائی گئی ہے۔

پروفیسر صداقت سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے۔ ان کے خلاف بڑی منظم سازش کی گئی تھی۔ ان کا ٹیلیفون اس لیے کاٹ دیا گیا تھا کہ وہ اخبارات یا پولیس سے رابطہ نہ قائم کریں۔ ان کے خلاف بیانات پہلے ہی جاری کر دیے گئے تھے۔ ان کے خلاف پرچا کاٹنے کے انتظامات بھی پہلے ہی مکمل ہو چکے تھے۔ مظلوم بن کے ملک پہلے ہی... اسپتال میں جا لیٹا تھا۔ اب اخباری نمائندے اور ہم خیال سیاست داں اسپتال کا رخ کریں گے۔ عیادت کے لیے اور سنسنی خیز تفصیلات کے لیے، ان کی پریس کانفرنس میں کون آئے گا؟

گھر کے باہر اچانک شور سن کے وہ دروازے کی طرف لپکے۔ شاہینہ نے انھیں روک لیا۔

"یہ وہی نہ ہوں، گھر کو آگ لگانے والے۔"

"تمھارا دماغ خراب ہے۔ اس حلقے میں سمجھ دار لوگ رہتے ہیں۔ وہ مجھے بھی جانتے ہیں اور ملک کو بھی۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اخبار میں اس خبر کی اشاعت نے لوگوں کو مشتعل کر دیا ہو۔" شاہینہ نے کہا۔ "یہ کام کرایا بھی تو جا سکتا ہے۔"

بات پروفیسر کے جی کو لگی تھی مگر خوف زدہ ہو کے گھر میں بیٹھ جانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ باہر نکل کے انھوں نے غنڈوں سے انسانیت اور شرافت کے نام پر اپیل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن گھر کے سامنے جانے پہچانے چہروں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ یہ اسی حلقے سے "صداقت و انصاف پارٹی" کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدوار اور اس کے آدمی تھے۔ پروفیسر صداقت نے اخبارات میں وہ سیاسی تبصرے اور تجزیے دیکھے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ اس حلقے میں اصل مقابلہ اب "جے ایچ پی" کے ملک صاحب اور ایس آئی پی کے شاہ صاحب کے درمیان متوقع ہے۔ تاہم آزاد امیدوار پروفیسر صداقت کی پوزیشن بھی مستحکم نظر آتی ہے۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں پروفیسر صاحب۔" "صداقت و انصاف پارٹی" کے امیدوار نے آگے بڑھ کے ان سے خود مصافحہ کیا۔ "مجھے ساری بات معلوم ہو چکی ہے۔"

"شاہ صاحب! میں نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا ابھی تک۔" پروفیسر صداقت یار نے حیران ہو کے کہا۔

"کل آپ کے ساتھ جو غنڈہ گردی ہوئی تھی وہ میرے ایک رضاکار کے گھر کے سامنے ہوئی تھی۔" شاہ صاحب نے کہا۔ "اس نے پولیس کو فون بھی کیا تھا مگر پولیس نے آنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ایس پی سے بات کی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں شاہ صاحب۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "لیکن... آپ نے یہ سب کیوں کیا میرے لیے؟"

"آپ کے لیے نہیں، اپنے حلقے میں غنڈہ گردی کے خلاف۔ اس کا نشانہ آج آپ ہوئے ہیں تو کل ہم بھی ہو سکتے ہیں۔ سیاسی سطح پر ہمارے اختلافات کو شائستگی کے دائرے میں رہنا چاہیے۔ میں تو آج کے اخباروں میں ان کے بیانات پڑھ کے حیران رہ گیا۔ کیسی دیدہ دلیری ہے کہ چوری اور سینہ زوری! نہ خدا کا خوف نہ اس کے بندوں کی شرم۔"

"انھوں نے مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ میں نے اپنا نام واپس نہ لیا تو وہ میرے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ بیوی بچوں کو اٹھا لیں گے۔"

"ہم صبح صبح اسی لیے آ گئے کہ ملک کی چال کو ناکام بنا دیں۔ اس کے کچھ چیلے اکٹھے ہو رہے تھے آپ کے گھر پر حملہ کرنے کے لیے۔ بہانہ یہی ہوتا کہ ملک پر حملے کی خبر نے ان کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے میں نے ایس پی کو مطلع کر دیا اور اپنے بندے لے کر آ گیا۔ یہ سب مسلح ہیں۔"

"شاہ صاحب! یہ تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی..." پروفیسر صداقت نے پریشان ہو کے کہا۔ "اگر یہاں مسلح تصادم ہوا۔"

"طاقت کا توازن برابر ہو تو کچھ نہیں ہوتا۔ آپ اکیلے ملک کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔" شاہ صاحب نے کہا۔ "اب ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ دیکھتے ہیں زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔"

شاہ صاحب نے عملاً "صداقت و انصاف" کے حق میں آواز اٹھا کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بہر صورت ملک سے بہتر امیدوار ہیں اور انھوں نے پروفیسر صداقت جیسے حریف پر ایک اخلاقی فتح حاصل کر لی تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے مگر ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے روحانی عقیدت مند بھی لاکھوں میں تھے۔ وہ جاگیردار بھی تھے چنانچہ انتخابی معرکے میں انھوں نے بھی ملک سے کم دولت نہیں لٹائی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ انھوں نے غنڈہ گردی اور زور زبردستی کی سیاست سے اجتناب کیا تھا۔

ابھی پروفیسر صداقت سوچ ہی رہے تھے کہ شاہ صاحب کے حق میں دستبردار ہو جائیں اور اپنا نام واپس لے کر شاہ صاحب کی "صداقت و انصاف پارٹی" کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر دیں کہ انھیں "جمہوری حقوق پارٹی" کی ہائی کمان کی طرف سے ملاقات کی دعوت موصول ہو گئی۔

"اب کیا فائدہ۔" پروفیسر نے کہا۔ "ان کے اور ہمارے راستے جدا ہو گئے۔"

"پھر بھی مل لینے میں کیا حرج ہے۔" شاہینہ نے کہا۔

ایک محفل میں مخدوم محی الدین نے شاہد صدیقی سے پوچھا۔ "یار، میر کے اس شعر کا مصرع اولیٰ کیا ہے کہ 'اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے'؟"

شاہد صدیقی نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بولے۔ "یہ بات کہہ کے میر تقی میر مر گئے۔"

"میں اپنا اصولی مؤقف نہیں بدل سکتا۔ میں منافقت کی سیاست نہیں کر سکتا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "پھر وہ کیوں ملنا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

"اس لیے کہ آپ کی پوزیشن اس حلقے میں سب سے بہتر ہے۔" شاہینہ نے کہا۔ "آپ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

پروفیسر صداقت حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔ "مجھے اب کوئی خوش فہمی نہیں رہی۔ بہت ملے تو مجھے اس حلقے سے دس ہزار ووٹ مل جائیں گے جبکہ یہاں لاکھوں ووٹرز ہیں۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔" شاہینہ نے کہا۔ "یہاں سات آزاد امیدوار ہیں۔ ان میں دو تو کاغذات داخل کر کے پچھتا رہے ہیں۔ چار شاید دستبردار نہ ہوں مگر ان کو اتنے کم ووٹ ملیں گے کہ شاید سب کی ضمانت ضبط ہو جائے گی۔ اہمیت ہے صرف آپ کے دس ہزار ووٹرز کی۔ شاہ صاحب اور ملک صاحب کی پوزیشن تقریباً ایک سی ہے۔ انیس بیس۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مقابلہ یک طرفہ ہے۔ ایسے میں آپ کے دس ہزار ووٹ فیصلہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ جسے آپ کی تائید حاصل ہوگی وہ یقیناً جیت جائے گا۔"

مشہور یہ ہے کہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ شاہینہ کی مدلل بات نے پروفیسر صداقت کو دم بخود کر دیا۔ ان کی نصف بہتر پہلے بھی انھیں کارآمد سیاسی مشورے دیتی آئی تھی مگر اب تو وہ ان سے بہتر سیاست داں ثابت ہو رہی تھی۔ انھوں نے مذاکرات کی دعوت قبول کر لی۔

عین اس وقت جب "صداقت ہاؤس" میں ایک اجلاس پروفیسر صداقت کی حمایت حاصل کرنے کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے جاری تھا، "جمہوریت ہاؤس" میں پروفیسر صداقت اور ملک کے لیے ایک مصالحتی فارمولا زیر غور تھا۔

"پروفیسر کے حامی ووٹر پانسا پلٹ سکتے ہیں۔" ملک نے پریشانی سے کہا۔

"اور شاہ صاحب کو ایسے وقت میں وار کرنے کا موقع خود تم نے فراہم کر دیا۔" جے ایچ پی۔ کے صدر نے افسوس سے سر ہلایا۔"اب تم خود پروفیسر سے سودا کرو۔"

"وہ سودا کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ ایسے ہی لوگ سیاست میں داخل ہو کے ہمارے لیے پریشانی پیدا کرتے ہیں۔" ملک نے کہا۔"اب پارٹی اس سے کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر مذاکرات کرے تو شاید وہ پھر مان جائے۔"

پروفیسر صداقت کی آمد نے ان کے سلسلۂ گفتگو کو منقطع کر دیا۔ ایک عالی ظرف حریف کی طرح پروفیسر صداقت نے ملک سے بھی مصافحہ کیا۔

"اب کیا حال ہے آپ کا؟" پروفیسر نے طنز آمیز عیاری سے کہا۔"میں نے سنا تھا کہ کچھ غنڈوں نے حملہ کر دیا تھا آپ پر۔ آپ نے تصدیق کیے بغیر میرا نام لے دیا۔"

ملک کڑوا گھونٹ پی کے رہ گیا۔ پروفیسر صداقت اب وہ پہلے والا میدانِ سیاست کا نو وارد رہرو نہیں تھا۔ وہ کسی پرانے شہسوار کی طرح مستعد تھا۔

"غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہو گیا پروفیسر صاحب، پھر ان اخبار والوں نے کچھ کا کچھ چھاپ دیا۔" ملک نے کہا۔

"سنا ہے کل شاہ صاحب سے کوئی بات ہوئی ہے آپ کی؟" جے ایچ پی کے سربراہ نے مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

"ہوئی تو نہیں ہے مگر وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی حمایت میں دستبردار ہو جاؤں؟"

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کچھ شرائط دی ہیں میں نے ان کو۔" پروفیسر نے کہا۔

"دیکھیے پروفیسر صداقت صاحب۔ ہم اور آپ پرانے ساتھی ہیں۔"

"ہم ایک دوسرے سے لاتعلقی کا اعلان کر چکے ہیں۔"

"پھر بھی مصالحت کے دروازے تو ہم نے بند نہیں کیے اور اختلافات کہاں نہیں ہوتے۔" جے ایچ پی کے سربراہ نے کہا۔ "ہمارے درمیان ایسے اختلافات تو نہیں جو طے نہ کیے جا سکیں۔ انھی شرائط پر آپ کو پہلے ہم سے بات کر لینی چاہیے جو شاہ صاحب کے سامنے رکھی ہیں آپ نے۔ یقیناً ہم انھیں پورا کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ کو ملکی و غیر ملکی رائے عامہ کا اندازہ ضرور ہو گا۔ اس میں کسی کو بھی شک نہیں کہ ہم ستر فی صد سیٹیں حاصل کر لیں گے۔"

"یہی ایس آئی پی کہتی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔"ان کے پاس بھی ایسی ہی رپورٹیں ہیں۔ ملکی ذرائع ابلاغ کے سروے پر میں بھروسا نہیں کر سکتا۔ بیشتر رپورٹیں قیاس آرائیاں ہوتی ہیں یا جذباتی اندازے۔ بیرونِ ملک کوئی ہماری قوم کی سوچ اور رائے دہندگان کے مزاج کو نہیں سمجھتا۔ بہتر ہو اگر آپ کھل کے بات کریں۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ ملک صاحب کے حق میں دستبرداری کا اعلان کریں۔" جے ایچ پی۔ کے سربراہ نے کہا۔

"اور اس کے بدلے میں...؟"

"اس کے بدلے میں ہم آپ کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ کو دوسرے حلقے سے پارٹی کا امیدوار نامزد کر دیا جائے۔ کل آخری تاریخ ہے، حلقہ نمبر تین سو بارہ۔"

"وہاں سے آپ پہلے ہی ایک امیدوار کھڑا کر چکے ہیں۔"

"کل ہی وہ کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لے گا۔" جے ایچ پی کے سربراہ نے کہا۔

"اس حلقے میں آپ کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔"ویسے بھی کسی اور حلقے سے میری کامیابی مشکوک ہو گی جہاں لوگ مجھے جانتے ہی نہ ہوں۔"

"لوگ پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں، امیدوار کو نہیں۔"

"اگر یہ مجھے منظور نہ ہو۔ میں اپنے حلقے کے سوا کہیں سے آپ کا ٹکٹ قبول نہ کروں؟"

"تو آپ دستبرداری کی قیمت بتا دیں۔ ملک صاحب آپ کے دس ہزار ووٹرز کے بدلے دس لاکھ تک تو دے سکتے ہیں۔"

"گویا سو روپے میں ایک ووٹر کو بیچ دوں میں؟" پروفیسر صداقت نے طنز سے کہا۔"اتنا سستا ہوتا ہے ووٹر کیا؟"

"ووٹر تو ایک وعدے پر بھی خریدا جا سکتا ہے، ایک جذباتی نعرے پر بِک جاتا ہے، مگر اس کا وقت گزر چکا۔ اب آپ اپنی بات کریں، پروفیسر صداقت یار خاں۔" جے ایچ پی کے سربراہ نے کہا۔"پارٹی کی طرف سے بھی دس لاکھ لیں۔"

"میں فوراً جواب نہیں دے سکتا۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔"مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"

"لیکن وقت اب کہاں ہے۔ کل ہی آخری تاریخ ہے نامزدگی کے لیے۔"

"ابھی پوری رات ہے اور کل کا دن بھی ہے۔" پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ملک نے مایوسی سے جے ایچ پی کے صدر کو دیکھا

جس نے انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ سب معاملات بالمشافہ طے کرا دے گا۔

"ایک آخری بات۔" جے ایچ پی کے سربراہ نے اپنا ترپ کا پتا پھینکتے ہوئے کہا۔"اپنے ہی حلقے سے آپ کو صوبائی اسمبلی کے لیے ٹکٹ بھی دیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں آپ کے لیے صوبائی وزارتِ تعلیم میں گنجائش ہو گی۔"

'صوبائی وزیرِ تعلیم!' پروفیسر صداقت کے قدم رک گئے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ ہاں کہہ دیں۔ پھر انھیں بیوی کی بات یاد آئی۔"جس کو بھی آپ کی تائید حاصل ہو گی، وہ یقیناً جیت جائے گا۔ اپنی اس پوزیشن سے فائدہ اٹھانے کا یہی موقع ہے۔"

"میں آپ کو صبح بتا دوں گا۔" انھوں نے کہا۔

"پروفیسر صداقت! اگر شاہ جی نے تم سے کوئی وعدہ کیا ہے کہ تم کو مرکزی وزیرِ تعلیم بنوا دے گا۔ تو اس کے فریب میں مت آنا۔ اس کے اتنے اختیارات نہیں ہیں۔ بفرضِ محال، اس کی پارٹی جیت بھی جاتی ہے تو اپنی پارٹی میں اس کی کیا پوزیشن ہے۔ یہاں میں آپ سے پارٹی سربراہ کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ اور میں آپ کو چوائس دیتا ہوں۔ آپ قومی تعلیمی کمیشن کے سربراہ۔ ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین یا ڈائریکٹر جنرل..."

"میں سمجھ گیا۔ مرکزی وزیرِ تعلیم کے سوا میں کسی بھی عہدے کے لیے درخواست دے سکتا ہوں۔" پروفیسر صداقت یار نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

ملک نے صوفے کے بازو پر مکا مارا اور دانت پیس کر انھیں ایک گالی دی۔"یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے ماننے والے نہیں ہیں۔ میں نے تو کہا تھا کہ اس فتنے کا تدارک مجھ پر چھوڑ دیا جائے۔"

"تم کیا کرتے؟" جے ایچ پی کے سربراہ نے کہا۔

"میں اسے... غائب کروا دیتا... ڈاکو گھر میں گھس کے اس کو چھلنی کر دیتے..."

"اور اس کے بعد تم جیت جاتے۔" جے ایچ پی کے صدر نے تلخی سے کہا۔"ملک صاحب! آپ جیسے پرانے سیاسی شاطر سے میں ایسی غلطی کی توقع نہیں رکھتا — آپ کی معمولی سی جلد بازی نے پروفیسر صداقت کو ہم سے برگشتہ کیا اور ہمیں پبلک میں اپنی ساکھ بچانے کے لیے کتنے بڑے جھوٹ بولنے پڑے۔ وقت بدل گیا ہے ملک صاحب۔ سیاسی حریف کو اغوا کرنا اسے ہیرو بنانے کے مترادف ہے اور اسے مار کے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس کے دس ہزار ووٹ



جیت لیں گے۔ آپ خود اپنے بیس ہزار ووٹرز سے ہاتھ دھو لیں گے۔ شاہ جی کو خود جیتنے کا موقع فراہم کریں گے۔ ذرا عقل سے کام لیجیے۔ ایک پروفیسر کے گھر میں جو اصول پرستی اور ایمانداری کا کاروبار کرتا ہو، کسی ڈاکو کو کیا ملے گا۔ ان کتابوں کے سوا جو ردی میں بھی نہیں بکیں گی اور اس کے بدلے میں پارٹی کی نیک نامی کو ملکی سطح پر کتنا نقصان ہو گا۔"

"وہ اب اصول پرست اور ایماندار نہیں رہا۔ وہ سودا کر رہا ہے، بیک وقت آپ سے اور شاہ جی سے۔" ملک نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر میں نے بھی اس کو دو اور دو چار کر کے بتا دیا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر اس کی بولی کون لگائے گا۔ شاہ جی کیا دیں گے اسے۔"

"شاہ جی کسی پارٹی کے سربراہ نہ سہی، ان کے خاندانی اثر رسوخ کو آج تک کوئی نظر انداز نہیں کر سکا۔" ملک نے کہا۔"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ان کے بھائی کو خود آپ کی پارٹی نے ٹکٹ دیا ہے اور کامیابی کی صورت میں وہی صوبائی وزیرِ اعلیٰ ہو گا۔ پھر کون زیادہ وثوق سے پروفیسر کو وزیرِ تعلیم بننے کی پیش کش کر سکتا ہے۔"

"شاہ جی کی کابینہ میں کسی دانشور کی گنجائش نہیں ہو گی ملک صاحب۔ ان کی حکومت خاندانی لوگوں پر مشتمل ہو گی۔ خاندانی پیر، جاگیردار، بیوروکریٹس۔ آپ دیکھیں، وہ صبح تک ضرور آئے گا۔" جے ایچ پی کے سربراہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

واپسی پر رات نو بجے پروفیسر صداقت یار نے اپنے گھر کے دروازے پر چند مشکوک نظر آنے والے افراد کو ٹہلتے پایا۔ گلی کے موڑ پر انھوں نے سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی گاڑی بھی دیکھی تھی جس پر جھنڈے کو لپیٹ کر کور کے نیچے چھپایا گیا تھا۔ اپنے قد، حلیے اور لباس سے وہ سب واضح طور پر کسی خفیہ ایجنسی کے آدمی نظر آتے تھے۔ پروفیسر صداقت یار

اب ان کو صورت دیکھ کر پہچاننے لگے تھے۔

"پروفیسر سداکت یار خاں؟" ایک نوکیلی مونچھوں والے نے کہا۔

"ہاں میں ہی صداقت ہوں۔"

"آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا جی۔" اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "نواب زادہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔"

"وزیر تعلیم نے؟" پروفیسر صداقت نے بے یقینی سے کہا۔ "ان کو کیا کام پڑ گیا اس فقیر سے۔"

"فکیر؟ کون فکیر، کوتی مار و جی فکیر کو۔ سداکت صاحب آپ ہیں تو چلیں۔"

"بھئی! میں گھر کے اندر جا کے بیوی کو تو بتا دوں۔"

پروفیسر نے محسوس کیا کہ اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے، وہ سرکار کے نمائندے تھے اور حکم کی تعمیل کرانا جانتے تھے، تاہم انھوں نے قدرے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کو اندر جانے دیا۔

پروفیسر صداقت یار خاں کی اہلیہ لپک کر آئی۔ اُس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ "معلوم ہے کس کا فون آیا تھا؟"

"مجھے تو یہ معلوم ہے کہ باہر جو فرشتے کھڑے ہیں وہ مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "خدا خیر کرے۔"

شاہینہ ہنسی۔ "ارے کیوں ڈرے مرے جاتے ہو، وہ سرکاری گاڑی تمھارے لیے آئی ہے۔"

"ایسی ہی گاڑیوں میں بیٹھ کر جانے والے سی آئی اے سینٹر یا شاہی قلعے کے تہ خانوں میں گئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔"

"خدا نہ کرے۔" شاہینہ نے گھبرا کے کہا۔ "تم تو اُلٹا ہی سوچتے ہو۔ اچھی بات مُنہ سے نہیں نکلتی۔"

"مجھے وزیر تعلیم نواب زادہ صاحب نے بلایا ہے۔"

"انھی کا فون آیا تھا تمھارے جاتے ہی۔" شاہینہ نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کون نواب زادہ ہے۔"

"تم نے بتا دیا ہوگا کہ میں کہاں ہوں۔"

"کیوں نہ بتاتی، تم کسی چور اُچکّے سے ملنے تو نہیں گئے تھے۔"

"ہاں! ان سے بڑے لوگ تھے وہ... خیر، بات بتاؤ۔"

"جب انھوں نے کہا کہ میں وزیر تعلیم ہوں، پروفیسر صاحب سے ملاقات کب ہو سکتی ہے، وہ سرکٹ ہاؤس سے بول رہے تھے، رات کی فلائٹ سے ان کو واپس جانا تھا، کیا انھوں نے وہاں فون کیا؟"

"جمہوریت ہاؤس؟ کیا ہوگا تو مجھے کس نے بتانا تھا۔ کہہ دیا گیا ہوگا کہ یہاں کوئی صداقت نہیں اور نہ کوئی جانتا ہے صداقت کو۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

باہر سے دروازہ بجانے والے نے کہا۔ "سداکت یار، جلدی کرو۔"

انھیں تلفظ ہی نہیں اس کا اندازِ تخاطب بھی بُرا لگا مگر انھوں نے اسے جاہل سمجھ کے معاف کر دیا۔

"جائے بنا بھی چارہ نہیں..."

"وہ ضرور کوئی فائدے کی بات کریں گے۔ ان کا لہجہ بہت شریفانہ تھا اور تمھاری تعریف بھی بہت کر رہے تھے۔" شاہینہ نے فخر سے کہا۔ "وہ جو تمھاری کتاب ہے نا 'جمہوریت یہاں ہے...'"

"جمہوریت کہاں ہے۔" پروفیسر نے تصحیح کی۔

"خیر، انھوں نے یہی نام لیا تھا، جمہوریت یہاں ہے۔ مگر میں کیسے کہہ سکتی تھی کہ آپ تو کتاب کا نام ہی غلط لے رہے ہیں۔"

"وزیر تعلیم جو ہوئے۔" پروفیسر نے طنز سے کہا۔

"بہت تعریف کر رہے تھے کتاب کی، اب تم یہ موقع مت گنوانا، مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی فائدے کی بات کریں گے۔"

"چلو بس اپنی سیاسی بصیرت کو سنبھال کے رکھو، آخر خدا نے مجھے بھی عقل دی ہے۔" پروفیسر صداقت نے برہمی سے کہا۔ "تم دیکھتی ہو ہر کام میں اپنا فائدہ۔ ابھی بیس لاکھ ٹھکرا کے آیا ہوں میں، اب کیا کروں۔ وزیر تعلیم سے کہوں کوئی ٹھیکا دلوا دیں۔ فائدہ تو اسمگلنگ میں بھی بہت ہوتا ہے۔"

گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد بھی پروفیسر صداقت کا غصہ کم نہیں ہوا۔ "فائدے کی بات، اونہہ!"

"آپ نے میرے کو کچھ بولا سداکت یار..."

"نہیں بھائی میں پاگل ہوں۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوں، تم نے کیا سداکت سداکت لگا رکھی ہے، اور یہ کہتے ہو یار۔" پروفیسر نے بگڑ کے کہا۔ "بات کروں گا میں... منسٹر صاحب سے۔"

پروفیسر کے یہ تیور دیکھ کے ان دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، کہ اتنے چھوٹے سے گھر بلکہ غریب خانے سے کوئی وی آئی پی بھی برآمد ہو سکتا ہے۔ باقی راستہ وہ فلط اُردو میں ان سے غلطی کی معافی مانگتے گئے۔

وزیر تعلیم سرکٹ ہاؤس کے اس کمرے میں تنہا تھے انھوں نے سیکرٹری کو ہدایات دیں کہ درمیان میں صدر یا وزیر اعظم کے سوا وہ کسی کی فون کال ریسیو نہیں کریں گے۔ پھر انھوں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور پروفیسر صداقت یار خاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ابھی تک فقیرانہ شانِ استغنا کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔

"پروفیسر صداقت صاحب۔" انھوں نے قالین پر ہاتھ باندھ کے بے چینی سے ٹہلنا شروع کیا۔ "کل میں نے آپ کی فائل منگوائی تھی۔"

"کون سی فائل، سی آئی ڈی کی رپورٹوں پر مشتمل؟"

"جی نہیں، اس انکوائری کمیٹی کی رپورٹ پر مشتمل جس پر آپ کی برطرفی کے احکامات جاری کیے گئے تھے۔" وزیر تعلیم نے کہا۔

"وہ تو بہت پرانی بات ہے۔"

"ہاں، میں نے اس تاخیر پر شوکاز نوٹس دیا ہے۔ بہت پہلے مانگی تھی وہ فائل میں نے۔" وزیر تعلیم نے پھر سگار جلایا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ سب ایک سازش تھی آپ کے خلاف۔ مجھے اس کا بیک گراؤنڈ بھی معلوم ہوا۔ کوئی رکنِ اسمبلی ہے ملک، اس کے بیٹے کو آپ نے پاس کرنے سے انکار کیا تھا۔"

"پاس تو وہ ہو گیا تھا۔" پروفیسر صداقت نے تلخی سے کہا۔

"آئی نو، وہ اسسٹنٹ کمشنر ہو گیا ہے۔ ملک اس کی پوسٹنگ اپنے شہر میں کرانا چاہتا ہے، مقصد انتخابات میں سرکاری مشینری کو استعمال کرنا ہوگا۔ اسے وزارتِ امورِ کشمیر میں سیکشن آفیسر بنا کے بھیج دیا گیا ہے، خیر۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ وہ سارا چکر ملک نے چلایا تھا تو میں نے انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ اس میں سب اسی کے آدمی تھے، یک طرفہ ہو گیا تھا وہ سارا معاملہ۔ میں نے اس رپورٹ کو اور اس پر جاری ہونے والے احکامات کو ختم کر دیا ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے انصاف کیا۔ دیر سے ہی سہی۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "لیکن میں اب واپس وہاں نہیں جا سکتا، نواب زادہ صاحب۔"

"اس کا کوئی سوال نہیں۔" نواب زادہ نے کہا۔ "تم نے یقیناً کڑی آزمائش کا وقت گزارا ہے، سیاست میں بھی تمھارے ساتھ ناانصافی ہوئی، خیر یہ تو کھیل ہی ایسا ہے، ایک بار پھر اسی ملک نے تم کو مات دی۔"

"آپ کی معلومات بہت اَپ ٹو ڈیٹ ہیں۔"

"حکومت تمھارے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی یوں کر سکتی ہے کہ تم کو۔" انھوں نے سگار کا کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ "ایک چوائس دیا جائے، اس وقت تم بیک ڈیٹ سے بحالی کے بعد پرموشن لے کر پرنسپل کا چارج لے سکتے ہو، سول سروس اکیڈمی۔ یا رجسٹرار اسلام آباد یونیورسٹی یا پھر ممبر پبلک سروس کمیشن۔ احکامات کل جاری ہو سکتے ہیں اگر تم ابھی چوائس بتا دو۔"

"اور اس عنایتِ خسروانہ کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا سر؟"

"کچھ نہیں، تم چھوڑو یہ سیاست کا چکر۔ اس میں خواری بہت ہے۔" نواب زادہ صاحب نے کہا۔ "تمھیں عہدے کے مطابق رہائش، عملہ اور کار ملے گی۔"

"میں نے ایک چوائس کو ابھی کچھ دیر پہلے مسترد کیا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ حکومت کی طرف سے میرے لیے اتنی بڑی بولی لگائی گئی ہے تو اس کی وجہ ضرور ہوگی۔ مجھے اس احسان کی قیمت کیسے چُکانی ہوگی۔"

"تم اپنے کاغذات واپس لے لو، قانوناً بھی سرکاری ملازم سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔" انھوں نے انگریزی میں کہا۔ "اور اعلان کر دو کہ تم شاہ صاحب کے حق میں دستبردار ہو رہے ہو، فی الحال کسی کو حکومت کی کمٹمنٹ کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"شاہ صاحب کے حق میں؟"

"ہاں، کیوں کہ انتخابات میں انھی کو جیتنا چاہیے، ویسے بھی تم کو ملک سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"کیا حکومت انتخابات سے پہلے ہی طے کر چکی ہے کہ کس کو جیتنا چاہیے اور کس کو نہیں؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "یہ سب ڈھونگ ہے، انتخابی مہم اور..."

"اوہ یس، حکومت ملک کا نظم و نسق چلانے کی ذمے داری ان پر کیسے چھوڑ سکتی ہے جن کو اس ملک کی جاہل اکثریت منتخب کر کے اسمبلی میں پہنچا دے۔ بیس بائیس فی صد تعلیم یافتہ افراد کا تناسب ہے، کیا ان پر اسّی فی صد جاہل حکمراں ہوں گے؟ یہ کوئی نہیں چاہتا، اور نہ ممکن ہے، ہمارے بین الاقوامی دوست بھی یہ ڈراما ضروری سمجھتے ہیں، لیکن وہ مطلق جمہوریت، یا مطلق العنان جمہوریت کے حق میں نہیں ہیں۔ حکومت انھی کے پاس رہنی چاہیے جو حکومت کو سمجھتے ہوں، اس کا تجربہ رکھتے ہوں، حکومت ایک ادارہ ہے۔ جیسے کوئی کالج یا یونیورسٹی۔ کیا آپ گوارا کریں گے کہ اسے جاہل عوام کے منتخب نمائندے چلائیں؟ نہیں، آپ اس کے لیے کچھ شرائط، کچھ کوالیفکیشن رکھتے ہیں سامنے، حکومت چلانا کوئی بچّوں کا کھیل نہیں ہے۔" وزیر تعلیم نے کہا۔

پروفیسر صداقت کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وزیر تعلیم کی منطق سے اتفاق کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا، ان کا ذہن ایک جمہوری سوچ کا عادی تھا اور اب تک انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا اس میں جمہوریت ہی کو شخصی آزادی اور اجتماعی مفادات کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ وزیر تعلیم جمہوریت کا ایک نیا تصور پیش کر رہے تھے جس میں انتخابات کے ذریعے منتخب افراد کی کامیابی حکومتی اداروں کے تسلسل اور کارکردگی کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھی۔

یہ فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکے تھے کہ ملک کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے وہ شاہ صاحب کے حق میں دستبردار ہو جائیں گے اور پھر اپنی حمایت انھی کے لیے وقف کر دیں گے۔ اس کی وجہ ملک کے خلاف ذاتی عناد کے جذبات کی تسکین نہیں تھی، ان کے فیصلے کی بنیاد مختلف عوامل پر تھی "جے ایچ پی" نے اپنا اصولی مؤقف ترک کر دیا تھا اور اب حصولِ اقتدار کو اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ اس مقصد کے لیے جے ایچ پی ان افراد سے تعاون کر رہی تھی جو نہ اچھے سیاست داں تھے اور نہ اچھے انسان جن پر جمہوریت کے قاتل ہونے کا الزام بھی تھا اور جو نجی زندگی میں گھناؤنے چہرے رکھتے تھے۔ "جے ایچ پی نے اب کھلم کھلا امیدواروں کی خرید و فروخت شروع کر دی تھی ظاہر ہے وہ سب سے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ جعلی نوٹوں کی طرح جھوٹے وعدوں کی کرنسی چلا رہے تھے اور مکر و فریب کی سیاست پر اُتر آئے تھے جو اُن کے نزدیک اس لیے جائز تھی کہ یہ "جنگ" تھی اور محبت کے علاوہ جنگ میں ناجائز بھی جائز ہے۔

اس کے برعکس "صداقت و انصاف پارٹی" اپنے منشور کی تشہیر کر رہی تھی اور اپنی حکومت کے سابقہ دور کے کارناموں کا مقابلہ موجودہ حکومت کی نااہلی سے کر رہی تھی۔ اس طرح وہ لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ ان کو پھر موقع ملا تو ملک پھر خوشحالی، استحکام اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ وہ مذہب کی اخلاقی تعلیم پر زور دیتے تھے اور ان کا نعرہ تھا "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ چنانچہ ان کے مخالفین الزام لگاتے تھے کہ وہ رجعت پسند لوگ ہیں۔ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ چوں کہ ابھی تک انھوں نے خود پروفیسر صداقت کو لالچ اور ترغیبات کے جال میں پھنسا کے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی اور ایک بار پروفیسر صداقت نے ان کے اخلاق کا ایک عملی نمونہ بھی دیکھا تھا جب سیاسی حریف ہونے کے باوجود وہ ان کی حفاظت کے لیے آ گئے تھے۔ چنانچہ پروفیسر صداقت کا خیال تھا کہ وہ باضمیر اور باکردار لوگ ہیں اور ان کی پارٹی عملاً صداقت و انصاف پارٹی ہے، یہ بھی حقیقت سے عدم آگہی تھی۔ پروفیسر صداقت نہیں جانتے تھے کہ سیاست کرنے والے اپنے اپنے انداز رکھتے ہیں اور ظاہر سے باطن کا اندازہ نہیں ہونے دیتے۔ ان سب کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے، مسندِ اقتدار تک رسائی۔ ایک اس لیے بُرا تھا کہ اس کی برائی سامنے آ گئی تھی۔ شاہ صاحب سے ابھی ان کا واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔

ان حالات میں پروفیسر صداقت کی خواہش بھی یہی تھی کہ شاہ صاحب کی جیت ہو اور حکومت کی طرف سے ان کی تائید کا اظہار پروفیسر صداقت کے خیالات سے مطابقت رکھتا تھا، وزیرِ تعلیم کی پیش کش بروقت اور فراخ دلانہ تھی، صداقت و انصاف پارٹی کی طرف سے ابھی تک انھیں کوئی پیش کش نہیں ہوئی تھی چنانچہ شاہ صاحب کے حق میں غیر مشروط دستبرداری سے بیک وقت بہت سے مقاصد حاصل ہوتے تھے۔ وہ... شاہ صاحب کو زیرِ بارِ احسان کر سکتے تھے۔ حکومت سے مخاصمت کو ختم کر سکتے تھے اور اب مخاصمت کا جواز بھی کوئی نہ تھا جب کہ حکومت ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو تسلیم کر رہی تھی اور اس کی تلافی بھی فراخدلانہ طور پر کر رہی تھی، وہ سیاست سے الگ ہو کے پھر زیادہ عزت کے ساتھ ایک مطمئن زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔ وہ ملک سے بدلہ بھی لے سکتے تھے اور بعد میں شاہ صاحب سے احسان کی مزید قیمت وصول کر سکتے تھے، ان کے بیٹے کو ابھی سے صوبے کا آئندہ وزیرِ اعلیٰ قرار دیا جا رہا تھا۔ یہ ناممکن تو نہ تھا اگر بعد میں ان کو ہی صوبائی وزیرِ تعلیم لے لیا جائے۔

"آپ کس مخمصے میں پھنس گئے پروفیسر صاحب؟"

وزیرِ تعلیم کے ضبط کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا۔ انھوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ فیصلہ آسان نہیں ہوگا، پروفیسر صداقت کو سوچنے کے لیے کافی وقت دیا تھا اور اس دوران میں چائے پیتے رہے تھے۔

پروفیسر صداقت چونک پڑے "معاف کیجیے گا۔ میں اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"مجھے رات کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔" نوابزادہ صاحب نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا "مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ میں خود کو بہت گھرا ہوا محسوس کرتا ہوں، آپ نے بہت محدود چوائس دی ہے۔ یونیورسٹی کا رجسٹرار، سول سروس اکیڈمی اور ممبر پبلک سروس کمیشن۔ یہ تینوں عہدے انتظامی نوعیت کے ہیں۔"

"دیکھیے، میں آپ کو ہائی کورٹ کا جج یا کمشنر تو بنوا نہیں سکتا۔" وزیرِ تعلیم نے پھر سگار جلا لیا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں... اگر وائس چانسلر مقرر کیا جا سکتا مجھے اسی جگہ تو میں سمجھتا کہ یہ صرف تلافی نہیں تعاون کا انعام بھی ہے، بے شک یہ بہت زیادہ ہے لیکن ناممکن نہیں ہے کیوں کہ بہ لحاظِ صلاحیت اور سنیارٹی..."

"صلاحیت اور سنیارٹی کی بات مت کیجیے، آپ سے کہیں زیادہ قابل اور سینئر لوگ موجود ہیں۔" وزیرِ تعلیم

نے سوچ کر کہا "یہ معمولی عہدہ نہیں ہے۔ بے شک تقرری صوابدید کا معاملہ ہے، مگر اسے ایک سیاسی تقرری سمجھا جائے گا۔ اور اس کی ہر سطح پر مخالفت ہوگی، پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ تاہم اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وائس چانسلر کے عہدے کی میعاد ختم ہونے میں ابھی تین ماہ باقی ہیں۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔

"یہ معاملہ کچھ ایسے طے ہوگا۔" وزیرِ تعلیم نے پھر سوچنے کی اداکاری شروع کی "کہ فوری طور پر تو آپ بحالی کے حکم کے ساتھ واپس اسی کالج میں جائیں اور اپنے عہدے کا چارج لیں، واجبات وصول کریں اور اپنی سنیارٹی کے اعتبار سے پروموشن لیں۔ وہاں کالج کے پرنسپل کی آسامی خالی ہے۔ علالت کی بنا پر پرنسپل نے رخصت لی تھی مگر اب انھوں نے معذرت کر لی ہے کہ وہ واپس نہیں آ سکتے چنانچہ انھیں ریٹائر کر دیا جائے۔ اس درخواست پر میں کل آرڈر بھی کر دوں گا۔ آئندہ ہفتے تک آپ کو پرنسپل بنا دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی رجسٹرار کے عہدے کے لیے آپ کا نام بھی تجویز کر دیا جائے گا۔"

"مگر میں نے عرض کیا تھا..."

"آپ پوری بات تو سن لیں میری، جو کام آسانی سے ہو سکتا تھا وہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ اس میں حکومت کے اختیارات کو چیلنج کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ کو براہِ راست وائس چانسلر بنانے سے حکومت کی پوزیشن نازک ہو جائے گی۔ آپ رجسٹرار کی حیثیت سے تین مہینے کام کیجیے، انتظامی نوعیت کا عہدہ ہے تو کیا ہوا، آپ میں صلاحیت ہے۔ تین مہینے بعد جب یہاں وائس چانسلر اپنے عہدے کی میعاد پوری کر لیں گے تو آپ کی تقرری میں کوئی قباحت نہیں ہوگی۔"

"تین مہینے بعد، لیکن اس وقت تو حکومت بدل چکی ہوگی اور وزیرِ تعلیم بھی شاید آپ نہ ہوں۔"

"یہ بات کیا میں نہیں جانتا؟ اس کے باوجود میں آپ سے وعدہ کر رہا ہوں تو کچھ سوچ کے کر رہا ہوں۔" نواب صاحب کا موڈ خراب ہو گیا "آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اخلاقی طور پر جن معاملات میں رازداری کا پابند تھا، وہ بھی آپ کو بتا دوں، اصولی طور پر یہ طے کر لیا گیا ہے کہ وزیرِ تعلیم سردار غوث بخش ہوں گے۔"

"کون سردار غوث بخش...؟"

"وہ شاہ صاحب کے ہم زلف ہیں اور میرے سمدھی۔"

پروفیسر صداقت کو ایک بہت بڑے اسکینڈل کے حوالے سے سردار غوث بخش کا نام یاد آیا۔ اب سے کئی سال قبل ایبٹ آباد جانے والی سڑک پر بائیس نو تعمیر شدہ پُل جو برساتی ندی نالوں پر بنائے گئے تھے، پہلی ہی بارش میں بہہ گئے تھے۔ بسوں کے نالے میں گرنے سے بہت سے لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے بعد غوث بخش کا نام ایک ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں آیا تھا جس میں ناقص میٹریل استعمال کیا گیا تھا اور مکمل ہونے سے پہلے ڈیم ٹوٹ گیا تھا۔ اس سے کئی گاؤں زیرِ آب آئے تھے اور بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا تھا لیکن اخبارات اور عوام کے واویلے پر قائم کیے جانے والے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آج کئی سال بعد بھی کسی سرد خانے میں پڑی تھی۔ ان درجنوں رپورٹوں کی طرح جو اعلیٰ سطحی تحقیقات کرنے والے متعدد کمیشن دے چکے تھے۔

"آپ اس ٹھیکے دار کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟" پروفیسر صداقت نے بے یقینی سے کہا "وہ تو میٹرک پاس بھی نہیں۔"

"میں غیر متعلقہ اور فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔" نوابزادہ صاحب کا پارہ چڑھ گیا "وزیر عوامی نمائندہ ہوتا ہے اور اس کے لیے کوالیفیکیشن کی شرط کہیں نہیں ہے۔ آپ نے تو تاریخ پڑھی ہے بلکہ پڑھائی ہے، مجھے بتائیے خواجہ شہاب الدین مرحوم کے پاس کیا ڈگری تھی؟ اس کے باوجود وہ علم و فضل کے پیکر تھے اور کامیاب ترین وزیرِ اطلاعات... آپ نے وائس چانسلر کا عہدہ مانگا ہے، وہ آپ کو مل جائے گا۔ طریقہ وہی ہوگا جو میں نے بتایا۔ آپ کو منظور ہے تو بتائیے ورنہ چھوڑیے اس بات کو، جو آپ کا دل چاہے کریں، سودے بازی تو آپ سے ہر سیاسی جماعت کرے گی مگر کسی کے پاس آپ کے لیے کوئی ٹھوس ضمانت نہیں ہوگی جو میں دے رہا ہوں۔"

پروفیسر صداقت یار نے کبھی جوا نہیں کھیلا تھا لیکن اب تقدیر اُن کے سامنے دروازے کھولتی جا رہی تھی۔ وہ ایک ایسے چوراہے پر آ گئے تھے جہاں سے ہر سمت جانے والا راستہ بے یقینی کے صحرا سے گزرتا تھا مگر اس کے بعد یقین کا نخلستان تھا۔ کامیابی، عزت، شہرت اور دولت کی منزل تھی۔ اب یہ ان کی اپنی ہمت اور قسمت کی بات تھی کہ وہ بے یقینی کے صحرا سے کیسے کم سے کم وقت میں گزر سکتے ہیں اور صحیح راستے کے انتخاب میں ان کی قسمت کہاں تک یاور ثابت ہوتی ہے۔

ایک طرف "جے ایچ پی" کا دروازہ تھا۔ آؤ اور بیس لاکھ نقد لے لو۔ دوسری طرف "ایس آئی پی" کا در کھلا ہوا تھا، تم صوبائی وزیرِ تعلیم بن سکتے ہو۔ تیسرا دروازہ حکومت نے ابھی ابھی کھول دیا تھا۔ دیکھو، کتنے عہدے تمھارے نگاہِ انتخاب کے منتظر ہیں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان سب

دروازوں تک رسائی کی شرط وہی ایک تھی۔ انتخابات سے دستبرداری، جو تھا دروازہ ان کا اپنا تھا اور اس کے پیچھے لامحدود خواب تھے۔ خوابوں کو تعبیر بھی مل سکتی تھی اور خواب جھوٹے بھی ہو سکتے تھے۔

فیصلہ ان کو کرنا تھا اور فوراً کرنا تھا کہ وہ کس دروازے پر دستک دیں۔ تین دروازوں سے کامیابی کی منزل تک وہ، دوسروں کے وعدوں پر اعتبار کر کے پہنچ سکتے تھے، جو تھے دروازے، کو کھولنے کے لیے ان کا اپنی قسمت پر اعتماد کرنا ضروری تھا۔ سیاسی وعدوں پر اعتبار اور قسمت پر اعتماد میں ایک جیسا رسک تھا۔ ان کے ساتھ دھوکا بھی ہو سکتا تھا مگر رسک لینا ناگزیر تھا۔

چنانچہ اس رات انھوں نے جُوا کھیلا اور بازی ہار گئے۔

اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نوشتۂ تقدیر تھا۔ سٹّا کھیلنے والے سے لے کر ریس میں دوڑنے والے گھوڑے تک، جو شخص بھی داؤ پر کچھ لگاتا ہے اس میں اپنے تجربے، اپنی عقل اور اپنی دُور اندیشی کے ساتھ اندازے قائم کرتا ہے مگر صرف ہارنے والا تسلیم کرتا ہے کہ جُوے میں پانسا تدبیر کے نہیں تقدیر کے فیصلوں کے تابع ہوتا ہے۔

پروفیسر صداقت یار نے جب شاہ صاحب کے حق میں دستبرداری کا اعلان کیا تو گویا ملک کی قسمت پر... شکست کی مہر لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ شاہ صاحب جیسے نیک، مخلص اور ایمان دار نمائندے کی موجودگی میں وہ بالکل ضروری نہیں سمجھتے کہ سیاست میں دخل در معقولات کریں۔ چنانچہ وہ اپنے درس و تدریس کے پیشے کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ قوم کے نونہالوں کو اپنے علم کی روشنی دے کر وہ ملک کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔

اخبارات نے ان کی سیاست سے ریٹائرمنٹ کے اعلان کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ چند دُور اندیش مبصّرین نے اس پر حیرت کا اظہار ضرور کیا اور اسے درپردہ حکومت سے گٹھ جوڑ کا نتیجہ قرار دیا مگر جب انھوں نے اپنے کالج میں اسی پوسٹ کا چارج لیا جہاں سے انھیں سیاست میں دھکیلا گیا تھا تو کسی کے لیے بھی ان کے عزائم کے بارے میں شک و شبہے کی گنجائش نہ رہی۔

ایک ہفتے بعد جب کاغذات نامزدگی داخل کرنے، ان پر اعتراضات کرنے اور نام واپس لینے کی تاریخ گزر چکی تھی اور الیکشن کمیشن امیدواروں کی فہرست بھی شائع کر چکا تھا۔

پروفیسر صداقت حسبِ سابق اپنے طلبا کو وہی سیاست اور تاریخ پڑھا رہے تھے جو لازم و ملزوم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جیسے مظلوم ہیں۔ اس میں نہ سائنس کے کُلیے ہوتے ہیں اور نہ حساب کے فارمولے جو متنازعہ سمجھے ہی نہیں جا سکتے۔ سیاسیات اور تاریخ میں ذاتی نقطۂ نظر، جانبداری کے جذبات، مجبوری اور خواہش سب شامل ہو جاتے ہیں۔

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور پروفیسر صداقت یار کو بحیثیت پرنسپل چارج لینے کے احکامات موصول نہیں ہوئے۔ پوری قوم الیکشن کے بخار میں مبتلا تھی۔ لوگ دستبردار ہونے والوں کو بھول چکے تھے۔ سب کی نظریں انتخابی معرکے پر تھیں۔ سرکاری دفاتر میں چپراسی سے لے کر وزیر تک گھروں میں اور ہوٹلوں میں، سڑکوں پر اور جلسہ گاہوں میں انتخابات کے سوا کوئی موضوع نہ تھا۔ قوم کا سارا وقت، سارے وسائل اور ساری توانائی سب انتخابات کے نتائج کے بارے میں قیاس آرائیوں پر صرف ہو رہے تھے۔ کسی کو پروفیسر صداقت سے ملنے کی یا ان کی بات سننے کی فرصت نہیں تھی۔

بالآخر ہنگامہ ختم ہوا۔ کشت و خون اور فسادات کے بعد حالات معمول پر آئے اور صداقت و انصاف پارٹی نے واضح اکثریت کی بنیاد پر حکومت تشکیل دی۔ ملک کو تقریباً بیس ہزار ووٹوں سے شکست ہوئی تھی اور یہ پروفیسر صداقت یار کو ملنے والے ووٹ تھے جو بالآخر فیصلہ کُن ثابت ہوئے تھے۔ دس بارہ ہزار ووٹ اگر ملک کے حق میں پڑ جاتے تو معمولی اکثریت سے ہی سہی مگر وہ کامیاب قرار پاتا۔

پروفیسر صداقت یار خان نتائج کا اعلان سنتے ہی شاہ جی کو مبارک باد دینے پہنچے تھے مگر وہاں مبارک باد دینے والوں کا اژدحام تھا۔ اس میں شاہ جی کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ پروفیسر کو خصوصی اہمیت دے سکتے اور اس کا شکریہ ادا کر سکتے۔ یہ صورتِ حال مہینہ بھر رہی۔ شاہ جی اسلام آباد آتے جاتے رہے کیوں کہ کابینہ کی تشکیل میں ان کا دُہرا کردار تھا۔ صوبائی انتخابات میں ان کے بیٹے نے کامیابی حاصل کر لی تھی اور اس کا وزیرِ اعلیٰ بننا یقینی ہو گیا تھا۔ وزیرِ تعلیم سردار غوث بخش ہی کو بنایا گیا تھا۔ سابق وزیرِ تعلیم نوابزادہ صاحب گوشۂ گمنامی میں چلے گئے تھے۔ دو ماہ بعد ان کی ملاقات پروفیسر صداقت سے ہو گئی۔

"وہ میری پرنسپل کی حیثیت سے تقرری کے احکامات تو ابھی تک موصول نہیں ہوئے۔" پروفیسر صداقت نے شکایتی اور احتجاجی لہجے میں کہا۔

"اچھا؟ میں تو احکامات جاری کر آیا تھا۔" نوابزادہ

صاحب نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔ "آپ سردار صاحب سے مل لیں نا؟"

"وہ تو مجھے نہیں جانتے اور ان سے میں یہ بات کر بھی نہیں سکتا۔"

"بھئی آپ کے حلقے میں شاہ صاحب ہیں انھیں ساتھ لے جائیں۔ کیا وہ اتنا سا کام بھی نہیں کریں گے آپ کا۔ آپ تو ان کے لیے انتخاب سے ہی دستبردار ہو گئے تھے۔ ان کا تو فون کر دینا ہی کافی ہو گا۔" نوابزادہ صاحب نے کہا۔ "آپ کو میں نے بتایا تھا کہ وہ ان کے ہم زلف ہیں۔"

"وہ آپ کے بھی تو سمدھی ہیں۔" پروفیسر نے یاد دلایا۔

"ہاں مگر سُنی اسی کی جاتی ہے جو اقتدار میں ہو۔" نوابزادہ نے کہا۔

پروفیسر صداقت کو پریشانی اس لیے بھی ہو رہی تھی کہ اگر ان کی ترقی نہ ہوئی تو وہ رجسٹرار کیسے بنیں گے۔ ادھر مقامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے کی میعاد پوری ہونے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا اور اس عہدے کے لیے ابھی سے نام لیے جا رہے تھے۔

یہ پروفیسر صداقت کی خوش قسمتی تھی کہ اگلے ہی دن ان کی ملاقات شاہ صاحب سے ایسے وقت میں ہو گئی جب وہ فارغ تھے۔

"بھئی پروفیسر صداقت صاحب۔" انھوں نے بے حد اخلاق اور گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ "آپ سے تو میں خود ملاقات کے لیے حاضر ہوتا مگر کیا کروں، الیکشن کے بعد کی مصروفیات نے مہلت نہیں دی۔"

"جی، مجھے اندازہ ہے۔" پروفیسر صداقت نے کہا۔ "میں آیا تھا مبارک باد دینے..."

"آپ آئے تھے...؟ کمال ہے، مجھے نہیں بتایا کسی نے۔"

پروفیسر صداقت نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ یہ کوئی بتانے والی بات نہیں تھی۔ "کیا آپ جانتے نہیں کہ وہ کس کے ووٹ تھے جو آپ کے حق میں پڑنے سے آپ کو کامیابی حاصل ہوئی ہے؟ وہ احسان جتا کے اور شاہ صاحب کو شرمسار کر کے مقصد حاصل کرنے کی اُمید نہیں رکھ سکتے تھے۔

شاہ صاحب نے ان کی بات بڑی دلچسپی سے سُنی، اور بیچ بیچ میں مسکرا کے "کمال ہے" بھی کہتے رہے۔

"نوابزادہ نے آپ سے غلط بیانی کی۔" شاہ صاحب نے پوری بات سُن کے کہا۔ "وہ کسی رشتے سے سردار غوث بخش کا سمدھی نہیں ہے۔ اس نے سفید جھوٹ بولا اور آپ نے اعتبار کر لیا۔"

"تو کیا آپ بھی ان کے ہم زلف نہیں ہیں؟"

شاہ صاحب مسکرائے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ اس کی اور میری بیوی کے درمیان بہن کا رشتہ ہے مگر وہ سوتیلی بہنیں ہیں اور ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں۔ حقیقت یہ ہے پروفیسر صاحب کہ اگر سردار غوث بخش کو آپ کے اور میرے مراسم کا علم ہو جائے تو آپ کا بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ میری سفارش آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ مگر خیر، اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کروں گا۔ صوبائی وزیرِ تعلیم کے اختیار میں جو کچھ ہے، وہ ہو جائے گا۔"

"اور ظاہر ہے، یہ سب عہدے ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔" پروفیسر صداقت نے تلخی سے کہا۔

"ماشاء اللہ آپ خود سمجھ دار آدمی ہیں۔ ایک صوبائی وزیر بھلا اسلام آباد یونیورسٹی کا رجسٹرار، سول سروس اکیڈمی کا پرنسپل یا پبلک سروس کمیشن کا ممبر کیسے مقرر کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ کو پرنسپل کی خالی اسامی پر لگا دیا جائے، اس کے لیے میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

"صرف کوشش۔" پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے، بندے کا کام کوشش کرنا ہے، باقی سب کچھ تو خدا کی ذات کرتی ہے۔" شاہ صاحب نے کہا۔

"یہ پروفیسر صداقت یار کی بدبختی کا نقطۂ آغاز تھا۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایک پریس کانفرنس طلب کر ڈالی اور اس میں وہ سب کہہ دیا جو اُن کو نہیں کہنا چاہیے تھا کیوں کہ دوسروں نے بھی ان سے وہ کہا تھا جو انھیں نہیں کہنا چاہیے تھا مگر وہ ایسے لوگ تھے جو کسی بات کا گواہ، ثبوت نہیں چھوڑتے تھے۔

پروفیسر صداقت یار کو سب سے پہلے ان کی بیوی نے بتا دیا تھا کہ بیس لاکھ نقد سارے وعدوں سے بہتر تھے اور انھوں نے وعدوں پر اعتبار کر کے وہ سب گنوا دیا ہے جو انھیں مل سکتا تھا۔ وعدے جھوٹے ہو سکتے ہیں، پیسہ جھوٹا نہیں ہوتا۔ کھوٹا سکّہ بھی کام آ جاتا ہے۔ آدمی کام نہیں آتا جس کی نیت میں کھوٹ ہو۔ یہ بات سچ ثابت ہوئی تھی۔

پروفیسر صداقت نے "جے ایچ پی" کے سربراہ سے لے کر سابق وزیرِ تعلیم تک اور شاہ صاحب سے ملک صاحب تک سب کی ذات کو ان الزامات میں شریک کر لیا جن کا وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے سودے بازی کی اس سیاست کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا۔ ان کا کہا ہوا ہر لفظ مجسّم صداقت تھا مگر صداقت کو عدالت بھی اس وقت تک نہیں مانتی جب تک وہ ثابت نہ ہو جائے۔

ایک بار پھر پروفیسر صداقت معطل کر دیے گئے۔ ایک

اور انکوائری کمیٹی بیٹھائی گئی۔ الزامات کی سنگین نوعیت کے پیشِ نظر اخبارات نے عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اس وقت تک پروفیسر صداقت کو ہتکِ عزت اور ہرجانے کے کئی نوٹس موصول ہو چکے تھے جو نواب زادہ صاحب، شاہ صاحب، ملک صاحب اور "جے ایچ پی" کے صدر کی طرف سے دیے گئے تھے۔ ہر نوٹس میں ان سے جو رقم طلب کی گئی تھی، وہ کئی کروڑ بنتی تھی۔ غیر مشروط معافی مانگنے کا مطالبہ پروفیسر صداقت نے مسترد کر دیا۔

صرف ایک مہینے میں ان کے خلاف فرج داری مقدمات قائم ہو گئے۔ ایک شام انھیں شاہ صاحب نے ملوایا کہ وہ... پروفیسر کے احسان کو بھولے نہیں ہیں چنانچہ وہ معاملات کو ختم کرانے میں ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب جب ان کے گھر پہنچے تو انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا اس کے بعد پولیس آ گئی اور انھیں زبردستی گھر میں گھسنے اور مجرمانہ نیت کے ساتھ دست درازی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں تھانے پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ شاہ صاحب تو گزشتہ دو دن سے اسلام آباد میں ہیں اور آئندہ دو دن بھی وہیں گزاریں گے۔

اس کیس میں ان کی بمشکل تمام ضمانت ہوئی۔ ایک بار پھر ان کے واجبات روک لیے گئے تھے۔ راہ چلتے لوگ ان پر حملہ کر جاتے تھے اور پولیس ان کی رپورٹ تک درج نہیں کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ پھٹے کپڑوں اور زخمی جسم کے ساتھ تھانے پہنچے تو انھیں وہیں روک لیا گیا اور مار پیٹ کے ایک کیس میں ان کا نام شامل کر لیا گیا جس میں دو افراد مارے گئے تھے۔ یہ واردات ان کے گھر سے دس میل دور ایک ایسے علاقے میں ہوئی تھی جہاں سے ان کا گزر بھی سالوں میں ایک بار ہوتا تھا۔ پھر ان کے پاس سے ناجائز اسلحہ برآمد ہو گیا اور وہ اسلحہ ہی آلۂ قتل بنا دیا گیا۔

انھیں بڑی حیرت ہوئی جب شاہ صاحب نے ان کو ذاتی ضمانت پر رہا کرا لیا لیکن یہ انھیں مزید مقدمات میں ملوث کرنے کے لیے ضروری تھا۔ وہ ایک دن شاہ صاحب کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ ایک بچے نے انھیں روک لیا۔

"انکل! میری بال۔" اس نے اشارے سے کہا۔

"گاڑی کے نیچے؟" پروفیسر صداقت نے کہا۔ بچے نے اقرار میں سر ہلایا۔ پروفیسر صداقت نے جھک کے دیکھا۔ مگر انھیں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ اور جھک کر تقریباً سڑک پر لیٹ گئے۔ اندھیرے میں انھیں کوئی چیز نظر آئی۔ انھوں نے اُسے بال سمجھ کے پکڑا مگر وہ کوئی ڈبا سا تھا۔ پلاسٹک کا چوکور ڈبا۔ ہٹا کے دیکھنے سے بھی بال نہیں ملی۔ وہ نیچے سے نکل آئے۔

"بھئی بال تو..." انھوں نے بچے سے کہنا چاہا مگر الفاظ ان کی زبان پر ٹوٹ گئے۔ شاہ صاحب کے ذاتی ملازمین نے ان کو پکڑ لیا۔ بچہ انھیں کہیں بھی دکھائی نہ دیا لیکن کار کے نیچے سے وہ پلاسٹک کا ڈبا نکل آیا جس پر پروفیسر صداقت نے بہت صاف فنگر پرنٹ چھوڑے تھے۔ تھانے پہنچ جانے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ وہ اپنے محسن شاہ صاحب کی گاڑی کے نیچے بم رکھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ ان کو جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھنے والے صرف شاہ کے مصاحب ہی نہیں تھے، راہ گیر اور محلے کے غیر جانب دار لوگ بھی تھے۔ ان کو تخریب کار، غیر ملکی ایجنٹ، دہشت گرد اور غدار سبھی کچھ کہا گیا۔ ان کے خلاف لکھے جانے والے نعروں سے پورے شہر کی دیواریں کالی ہو گئیں۔ "بد بختی کی علامت، صداقت صداقت"، "صداقت کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے" — دشمنِ ملت صداقت، دشمنِ انساں صداقت۔ ان نعروں کے علاوہ "عوامی" مطالبات بھی تھے۔ صداقت کو ختم کرو۔ صداقت پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جائے۔ صداقت کو سرِعام پھانسی دی جائے۔

جیل کے اندر صداقت کے یار، صداقت کے علمبردار، پروفیسر صداقت یار نے سب کچھ سُنا، دیکھا اور بھگتا اب انھیں یقین آیا کہ یہ اپنی طاقت پرواز سے زیادہ بلند اُڑنے کی سزا ہے کہ وہ عرش کے تصور میں فرشِ خاک پر آ گرے۔ وہ صاحبِ علم تھے۔ علم میں صداقت تھی۔ سیاست میں تجارت تھی۔ اصولوں کی، انسانوں کی، مفادات کی۔

ایک بار جب وہ سابق وزیرِ تعلیم کے روبرو فیصلے کی کش مکش میں گرفتار تھے تو انھیں اپنی تقدیر پر رشک آیا تھا، جس نے ان کے لیے چار سمتوں میں چار دروازے کھول دیے تھے اور انتخاب ان کے ہاتھ میں تھا کہ جس دروازے سے چاہیں کہیں "کھل جا سم سم"۔ ایک دروازے کے پیچھے بیس لاکھ کا خزانہ تھا۔ دوسرے کے پیچھے صوبائی وزارتِ تعلیم تھی تیسرے کے پیچھے وائس چانسلر کا عہدہ تھا اور چوتھے دروازے کے پیچھے ان کی ذاتی ہمت، محنت اور قسمت سے ملنے والی عزت و شہرت اور دولت سب ہو سکتی تھی مگر انھوں نے اس چوتھے دروازے کو قابلِ غور ہی نہیں سمجھا تھا۔

جیل کے اندر نادر شاہ ڈاکو نے انھیں پانچواں دروازہ

دکھایا۔ یہ وہ چور دروازہ تھا جس کا انھیں ابھی تک علم نہیں تھا یا احساس نہیں تھا۔ پرانے وقتوں کے دُور اندیش لوگ گھر میں ایک چور دروازہ رکھتے تھے جو چوروں کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ خود خطرے میں ہر طرف سے گھر جاتے تھے تو اسی چور دروازے سے نکل جاتے تھے اور دشمن ہاتھ ملتے رہ جاتے تھے۔ چور دروازہ شاہی محل میں بھی ہوتا تھا اور فصیلِ شہر میں بھی۔ جو نظر نہیں آتا تھا لیکن انتہائی مجبوری میں جب سارے راستے اور سب دروازے بند ہو جاتے تھے تو چور دروازہ ہی آخری جائے پناہ فراہم کرتا تھا۔

پروفیسر صداقت بالآخر قائل ہو گئے تھے کہ ان حالات میں جب کہ ان پر زندگی کے سب دروازے بند کر دیے گئے ہیں انھیں یہی چور دروازہ استعمال کرنا ہوگا جس کی طرف کسی کا دھیان جا ہی نہیں سکتا اور جو کسی کی نگاہ میں نہیں ہے۔

* * *

پندرہ سال بعد!

شرافت کا موڈ خاصا خراب تھا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ڈیڈی۔ اس چھوکری سے تو میں نمٹ لیتا جو آپ کی اسٹینو ٹائپ سیکرٹری اور آپ کی کنیزِ خاص ہے۔" وہ جاگنگ کے جوتوں سمیت صوفے پر دراز ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مس کنیز فاطمہ میں غیر ضروری دلچسپی لے رہے ہو۔"

"کنیز آخر ہوتی کس لیے ہے... آپ کو اگر اس میں دلچسپی نہیں تو مجھے کیوں روکتے ہیں۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"میرے آفس میں تمھاری یہ بد تمیزی سب کو گراں گزرتی ہے۔"

"ضرور گزرتی ہوگی کیوں کہ کنیز انھیں گھاس نہیں ڈالتی، آپ کی کنیز آپ کے اس غلام کو گھاس ڈالتی ہے، جو میں بڑے شوق سے چرتا ہوں ڈیڈی۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "لیکن آپ اپنے اس حکم کے غلام، دو ٹکے کے چپراسی کو سنبھالیں۔ آج تو ایک ہی ہاتھ مارا تھا میں نے اسے، آئندہ بتیسی نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

"تم آئندہ میرے آفس نہیں آؤ گے۔" انھوں نے سختی سے کہا۔ "آج جو کچھ ہوا وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ گھر نہیں ہے جہاں تم کو ہر رعایت مل جاتی ہے۔ اس لیے کہ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ تمھاری ماں کا لاڈ تمھاری ڈھال بن جاتا ہے اور تم ایک باپ کی مجبوری سے بھی فائدہ اُٹھا لیتے ہو۔ پبلک میں میرا ایک امیج ہے، میری عزت ہے۔"

"عزت؟ آر یو شیور ڈیڈ؟" وہ پھر ہنسا۔ "میرا خیال تھا

ایک صاحب، مولانا عبدالحلیم شرر سے ملنے گئے۔ آپ صبح کے وقت اکثر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوتے تھے اور بے مصرف ملاقاتوں سے گھبراتے تھے۔ یہ صاحب کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر رخصت ہوئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر لوٹ آئے۔ شرر نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیسے کچھ کہنا بھول گئے تھے؟" وہ صاحب بولے۔ "نہیں میں بھولے سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔"

کہ لوگ آپ سے ڈرتے ہیں کیوں کہ آپ حاکم ہیں مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ سے تو کوئی ڈرتا بھی نہیں۔ آپ کے اختیارات کچھ بھی نہیں۔ آپ کے اپنے محکمے کے لوگ آپ کی بات کو اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے، جتنی کُتے کے بھونکنے کو۔"

"بکواس بند کرو۔ شرافت کی ماں! اسے سنبھالو، تم دیکھ نہیں رہی ہو یہ مجھ سے کس لہجے میں بات کرتا ہے۔" انھوں نے غصّے میں لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

"باہر چلتی نہیں تو کسی پر تو غصّہ اُتارو گے گھر میں آ کے۔" شرافت کی ماں نے کہا۔ "کیا غلط کہہ رہا ہے وہ۔ کیا فائدہ، تمھارے وزیرِ تعلیم ہونے کا جب کالج کے ایک معمولی پروفیسر کو تمھاری پروا نہ ہو۔"

ایس وائی خان صوفے پر بیٹھ گئے۔ "تمھیں داخلہ نہیں ملا؟"

"نو سر۔" شرافت نے منہ گول کر کے کہا۔ "اس گنجے پروفیسر نے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ تمھارا باپ وزیرِ تعلیم ہے تو کیا۔ آئی ڈیم کیئر۔ تمھارے نمبر کم ہیں اور میں داخلہ میرٹ پر دوں گا۔"

"پرنسپل کون ہے؟"

"کوئی نہیں، وہ گنجا ڈین ہے فیکلٹی آف آرٹس کا۔ وہی پرنسپل بنا ہوا ہے۔" شرافت نے ٹانگ ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" ایس وائی خان نے کہا۔

"نام حق کا بندہ، عبدالحق۔"

"اس کا نمبر ملاؤ۔ میں بات کرتا ہوں اس سے۔" ایس وائی خان نے برہمی سے کہا۔ "اس کا باپ بھی داخلہ دے گا۔"

"یاہو۔" شرافت نے چیخ مار کے چھلانگ لگائی۔

"اب آیا نہ میرے باپ کو جلال۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ کیا پدّی اور

کیا بدی کا سوپ!" اس نے نمبر ملا کے رلیسیور باپ کو تھما دیا۔

"مجھے عبدالحق سے بات کرنی ہے۔" ایس وائی خان نے کہا۔

"میں بول رہا ہوں۔" جواب آیا۔

"عبدالحق صاحب، میں ایس وائی خان بات کر رہا ہوں۔"

"کون ایس وائی خان؟" عبدالحق نے بے نیازی سے کہا۔

"وزیرِ تعلیم۔" ایس وائی خان دہاڑ کر بولے۔ "ہوش میں ہو یا نہیں؟"

"آپ کی برہمی بے سبب ہے۔ صرف نام سے کیا پتا چلتا ہے سر، دن میں سیکڑوں فون آتے ہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"مگر وہ سب وزیرِ تعلیم نہیں ہوتے۔ مجھے بتاؤ کیا تم نے میرے بیٹے کو داخلہ دینے سے انکار کیا ہے؟"

"یس سر! اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ یہاں رش کا یہ عالم ہے کہ اے گریڈ ہی لیے ہیں ابھی ہم نے۔ ممکن ہے بی کی گنجائش بھی نکل آئے۔ آپ کے صاحبزادے کا گریڈ تو ڈی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن اسے داخلہ ملنا چاہیے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"آئی ایم سوری سر! میں انکار کر چکا ہوں، اصولی بنیاد پر۔"

"یہ انکار تم کو مہنگا پڑے گا۔ تم حکم عدولی کر رہے ہو۔" ایس وائی خان نے کہا۔

"میں کسی ناجائز یا غلط بات کو ماننے کا پابند نہیں ہوں۔ آپ کی دھمکی مجھے مرعوب نہیں کر سکتی۔ میں یہاں علم کی دکان لگا کے نہیں بیٹھا ہوں کہ مہنگا سستا دیکھوں۔ اصول پرستی کی سزا پہلے بھی بہت لوگ کاٹ چکے ہیں مگر ابھی تک دنیا سے اصول پرستی ختم نہیں ہوئی۔ اور نہ ہوگی۔ ہر دور میں میرے جیسے خبطی پیدا ہوتے رہیں گے سر۔" عبدالحق نے فون بند کر دیا۔

ایس وائی خان کا چہرہ غصّے سے سرخ پڑ گیا۔ ان کا.... بلڈ پریشر پہلے ہی کم نہ تھا۔ اس خبطی پروفیسر کے گستاخ اور سرکش رویّے نے ان کی حالت خراب کر دی۔ رلیسیور کو کریڈل پر پٹخ کے انھوں نے ایک گلاس پانی مانگا۔ جیب سے ایک شیشی برآمد کر کے دو گولیاں نگلیں اور کانپتے ہاتھوں سے گلاس لبوں تک لے گئے۔ ڈاکٹر نے انھیں غصّے سے دور رہنے کو کہا تھا۔ اشتعال کی اس کیفیت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دل کے ایک دورے سے تو وہ جاں بر ہو گئے تھے مگر دوسرا دورا جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

انھوں نے صوفے کی پشت سے سر لگا کے آنکھیں بند کر لیں اور ایک سے سو تک گنتی گننے میں مصروف ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ان کا تنفّس معمول پر آ گیا۔

بیوی نے ان کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ ٹشو پیپر سے صاف کیا اور کہا۔ "ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

ایس وائی خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ شرافت! میرا خیال ہے کہ تم دوسرے کالج میں داخلہ لے لو۔"

"مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی مشورہ دیں گے۔" شرافت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شرمندگی مجھے ہی اٹھانی ہوگی۔ مذاق میرا ہی اڑایا جائے گا دوستوں میں۔ آپ کا کیا ہے، اس بے عزتی کو بھی پی جائیں گے کیوں کہ آپ میں ہمّت نہیں ہے، ایک معمولی پروفیسر کے خلاف سخت قدم اٹھانے کی۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو اسے ایسی سزا دیتا کہ سب عبرت پکڑتے۔"

ایس وائی خان نے ایک گہری سانس لی۔ "او کے سَن، اگر اس نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو وہ پچھتائے گا تمام عمر۔ اب تم جاؤ، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

جوتے اُتارنے اور کپڑے بدلنے کے بعد وہ بہت دیر تک بیڈ پر پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھے رہے۔ عبدالحق کی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ حق پرستی کی سزا پہلے بھی بہت لوگ کاٹ چکے ہیں مگر ابھی تک دنیا سے اصول پرستی ختم نہیں ہوئی۔

'کیسی عجیب بات ہے؟' انھوں نے سونے کی کوشش میں ناکام ہو کے اپنی شاہانہ خواب گاہ کے دبیز قالین پر ٹہلنا شروع کیا۔ کہ آج بھی اصول پرست لوگ ہیں، پروفیسر صداقت یار خاں کی طرح۔ انھیں کیا سمجھا جائے؟ کوتاہ بیں اور عاقبت نااندیش۔ یا ازلی و ابدی سچائی کی علامت۔ یہ لوگ تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے؟ کیا اس حق کے بندے، عبدالحق کو معلوم نہیں کہ آدمی پر ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب وہ چور دروازے سے فرار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ پروفیسر صداقت یار خاں نے سب دروازے بند پا کے اسی چور دروازے کو استعمال کیا تھا اور پھر اس دنیا میں لوٹ آیا تھا جو اسے اپنے درمیان سے خارج کر چکی تھی، شکست دے چکی تھی اور فراموش کر چکی تھی۔ اسی چور دروازے سے نکل کے اس نے پھر دنیا کو فتح کیا۔ یہ ایک مشکل اور طویل جدّوجہد تھی۔ مگر اس میں

پروفیسر صداقت یار خاں نے زیادہ کچھ نہیں گنوایا۔ اس کے پاس رہا بھی کیا تھا۔ اپنے اصول اور نظریات، عقائد اور تصوّرات سے وہ پہلے ہی دستبردار ہو گیا تھا۔ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے بعد وہ ایک تاجر بن گیا تھا مگر اسے تجارت کرنا نہیں آتا تھا۔ اس نے خسارے کا سودا کیا اور اپنا سب کچھ ہار گیا۔

چور دروازے سے پھر دنیا میں قدم رکھنے کے بعد پروفیسر صداقت یار خاں نے صرف اپنے ماضی کو قربان کیا۔ اس نے ایک نئے نام کے لیبل کے ساتھ نئی شخصیت اختیار کی اور دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ اسے دیا تھا، وہ مع سود لوٹا دیا۔ وہ اب ایس وائی خان وزیرِ تعلیم تھا۔

اس رات جب ڈاکو نادر شاہ ملنگی کے لیے درِ زنداں کھلا تو وہ اس کے ساتھ باہر آ گئے۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے جیل سے فرار ہو کے انھوں نے پہلا جرم کیا تھا جس کا وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں اعتراف کر سکتے تھے مگر اس کے بعد انھوں نے ضمیر کی عدالت کو ہی برخواست کر دیا اور پروفیسر صداقت یار خاں سے کہا کہ تھینک یو، تمھارا اور میرا ساتھ یہاں ختم ہوتا ہے۔ تمھاری سچائی کا دوست ہونے سے مجھے کچھ نہیں ملا۔ اب مجھے سب کچھ حاصل کرنا ہے۔ اس لیے میں ایس وائی خان ہوں۔ شہرت یار خان، شان و شوکت یار خان، سطوت یار خان، بٹ ناٹ صداقت یار خاں!

ڈاکو نادر شاہ جو اُن کا نالائق شاگرد تھا، ایک بہترین استاد ثابت ہوا۔ اس نے صداقت یار کو اپنے ماضی سے الگ ہو کے جینا سکھایا۔ انھیں دشمنوں کی نظر سے محفوظ رکھا۔ پولیس ان کو ہر جگہ تلاش کرتی رہی۔ انھیں اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا اور ان کی تصویر ہر جگہ، ہر تھانے کو فراہم کر دی گئی۔ مگر جس شخص کی وہ تصویر تھی، وہ اب کہیں بھی نہیں تھا۔

پولیس نے اگلے دن ہی شاہینہ کو اس کے دونوں بچّوں کے ساتھ اٹھا لیا۔ اس نے ہر انسانیت سوز تشدّد کا نشانہ بننے کے باوجود اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اسے کچھ معلوم ہوتا تو وہ ضرور بتا دیتی۔ ڈاکو نادر شاہ نے پروفیسر کو سمجھا دیا تھا کہ اسے اپنا دل سخت کرنا ہوگا کیوں کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں گے۔ وہ چاہتا تھا کہ کم سے کم شاہینہ کو یہ ضرور بتا دے کہ وہ خیریت سے ہے مگر نادر شاہ نے کہا کہ اب نہ تم صداقت یار ہو اور نہ شاہینہ نام کی کسی عورت کے شوہر۔ بھول جاؤ ان سب کو جو تمھارے ماضی کے سفر میں تمھارے ساتھ تھے۔

تاہم نادر شاہ نے جہاں ایک طرف صداقت یار کو تحفظ فراہم کیا، وہیں بعد میں شاہینہ اور اس کے بچّوں کے لیے بھی گزارے کا بندوبست کر دیا لیکن یہ سب ایک سال کے بعد ہوا جب پولیس پروفیسر صداقت یار خاں کی فائل بھی بند کر چکی تھی۔ پولیس ریکارڈ اور مستند چشم دید گواہوں کے بیانات کے مطابق جیل سے فرار ہونے کے سات ماہ بعد پروفیسر صداقت یار خاں ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور فرضی نام سے مختلف مقامات پر متعدّد وارداتوں کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈاکو اور بھی مارے گئے تھے۔ ان سب کو شناخت کے بعد خود پولیس نے دفن کرایا تھا۔

شاہینہ کے لیے وہ بڑی اذیّت کا دور تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ پروفیسر صداقت جیل سے نکل کے کہاں گیا۔ جب پولیس اسے دوسرے دن اُٹھا کے لے گئی تھی تو اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا شوہر کسی نادر شاہ نامی ڈاکو کے ساتھ فرار ہوا ہے۔ یہ جان کے اسے خوشی بھی ہوئی تھی اور دُکھ بھی ہوا تھا۔ خوشی اس بات پر تھی کہ اس نے بالآخر کوئی کام تو مردوں والا کیا اور اس اصول پرستی کی روش کو ترک کر دیا جس نے تمام عمر اسے تنگی تُرشی کی عزّت کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ دُکھ اس لیے تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ پکڑا ضرور جائے گا اور پھر اس کی سزا بڑھ جائے گی۔

تھانے میں اس سے پروفیسر کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے انھیں یاد کر کے سات ماہ بعد بھی شاہینہ کا جسم کانپنے لگتا تھا۔ وہ ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتی تھی اور اس کا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ وہ کیسے یقین دلا سکتی تھی کہ اس کے شوہر نے اسے بالکل اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ وہ مسلسل ایک ہی بات دُہراتے تھے۔ تیرا خصم ہے، تیرے پاس نہیں جائے گا تو کس کے پاس جائے گا۔ اس نے ضرور بتایا ہوگا تجھے۔ بول کہاں ہے وہ۔ ایک رات، پھر دوسری رات، تیسری رات۔ ہر رات وہی عذاب کے فرشتے تازہ دم ہو کے آتے تھے اور پہلے سے زیادہ سفّاک اور ناپاک حربے اختیار کرتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ بالآخر وہ مر جائے گی مگر انھیں کچھ نہ بتا سکے گی۔ وہ یقین کرنے والے لوگ نہیں تھے۔

پھر اچانک اس کا عذاب ختم ہو گیا۔ جو لوگ اسے لے کر گئے تھے، وہی اسے واپس گھر چھوڑ گئے۔ وہ کسمپرسی کے عالم میں پڑی رہی۔ محلے والے بھی اس کی تیمارداری کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور بدنامی کے اس کوڑا گھر سے دُور رہنا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ خفیہ پولیس والے دن رات کے چوبیس گھنٹے اس

کے گھر کو ہر طرف سے گھیرے رہتے تھے کہ صداقت کسی بھی وقت آئے تو بچ کے نہ جا سکے۔

اس عرصے میں شاہینہ پر دیگر مصائب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک رات اس کے گھر میں چور گھس آئے، انھوں نے اس کے بیٹے گڈو کو پکڑ کے خنجر کی دھار اس کے گلے پر رکھ دی اور شاہینہ کو خاموش رکھا۔ جاتے وقت انھوں نے شاہینہ کو دونوں بچوں کے ساتھ باتھ روم میں بند کر دیا اور باہر سے بھی کنڈی لگا گئے۔ انھیں اس قید سے نجات اگلے دن ملی جب ان کی چیخ پکار نے ایک ہمسائے کو متوجہ کر لیا۔

فوری طور پر شاہینہ کو گھر کی ایک دو چیزوں کی چوری کا اندازہ ہی ہو سکا۔ وہ ریڈیو لے گئے تھے اور ٹائم پیس لے گئے تھے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی نہ تھیں کہ ان کی چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لیے وہ پھر اسی تھانے میں جاتی جس کے تصور سے ہی اس کی روح لرز جاتی تھی۔ ایک مہینے بعد جب اسے مختلف محکموں کے نوٹس موصول ہوئے کہ مکان پر ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا سولہ ہزار روپیہ واجب الادا ہے، پراپرٹی ٹیکس آٹھ سال سے نہیں دیا گیا ہے۔ واٹر ٹیکس کبھی دیا ہی نہیں گیا اور کارپوریشن کے واجبات الگ ہیں، یہ نوٹس الگ الگ یکے بعد دیگرے موصول ہوئے تو شاہینہ سمجھ گئی کہ یہ بھی انتقامی کارروائی ہے۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب ہاؤس بلڈنگ کا کوئی لون باقی نہیں، پروفیسر ہر قسم کا ٹیکس ادا کرنے کے معاملے میں کس حد تک خبطی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اس ملک کا ہر شہری ایمانداری سے ٹیکس نہیں دیتا تو وہ مجرم ہے۔ میں کیوں مجرم بنوں، وہ انکم ٹیکس میں ناجائز چھوٹ تک قبول نہیں کرتا تھا۔ اس یقین کے پیش نظر شاہینہ نے مکان کے کاغذات تلاش کیے تو اسے معلوم ہوا کہ اس رات گھر میں گھسنے والے صرف ایک پرانا ریڈیو اور ایک پرانی گھڑی لینے نہیں آئے تھے وہ پراپرٹی کے سب اصل کاغذات لے گئے تھے اور اب شاہینہ کے پاس نہ پاور آف اٹارنی تھی کہ وہ پھر کاغذات کی ڈپلی کیٹ حاصل کرے اور نہ کسی نوٹس کا جواب دینے کے لیے کوئی دستاویزی ثبوت۔

اس کی ساری تگ و دو بے کار گئی، کسی محکمے نے کاغذات کی نقل تک فراہم نہیں کی، کہیں اس سے کہا گیا کہ کون پروفیسر صداقت۔ وہ قاتل ڈاکو، کیا ثبوت ہے کہ تم اس کی بیوی ہو؟ کہیں اس سے نکاح نامہ طلب کیا گیا تو کہیں مختار نامہ۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب سے پہلے واٹر بورڈ والے مستعد ثابت ہوئے، انھوں نے پانی کی لائن کاٹ دی۔ پھر

ایکسائز ٹیکسیشن والوں کا فائنل نوٹس آیا۔ پھر نوٹس برائے قرقی جائیداد۔ ایک دن اچانک پولیس نے اس کا سامان باہر رکھا اور مکان کو سیل کر دیا۔ مکان کو واجبات کی وصولی کے لیے نیلام کرنے کا نوٹس بند دروازے پر چسپاں کر دیا گیا۔

شاہینہ کس کے پاس فریاد لے کر جاتی۔ اس کے پاس حکم امتناعی حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ دستاویزات نہ دعوے کے حق میں ثبوت، نہ وکیل کو ادائیگی کے لیے رقم۔ نہ کیس کرنے کے لیے کورٹ فیس، اس کے لیے سامان اٹھا کے اس محلے سے نکل جانے کے سوا چارہ نہ رہا جہاں اب کوئی اسے ترس کھا کے ایک وقت روٹی کھلانے کو بھی تیار نہ تھا۔ جن کے دل میں خوف خدا تھا ان کے دل میں پولیس کا خوف اس سے زیادہ تھا۔

شاہینہ کو بمشکل تمام ایک گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے جگہ ملی اور رہنے کے لیے اسے ایک سرونٹ کوارٹر بھی ملا۔ یہ سب بھی اس لیے ممکن ہوا کہ شاہینہ نے اپنا نام غلط بتایا۔ یہ کہا کہ وہ بیوہ ہے اور اس کا شوہر ایک ٹرک ڈرائیور تھا جو حادثے میں مارا گیا تھا۔ اس نے بچوں کو بھی یہ جھوٹ بولنے پر مجبور کیا اور اپنی اس مجبوری پر خون کے آنسو روتی رہی مگر زندہ رہنا ضروری تھا۔ اس امید کے باعث کہ صداقت زندہ ہے تو وہ کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔ جب پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے کا خوف باقی نہیں رہے گا تو وہ اپنے بیوی بچوں کو ضرور تلاش کرے گا۔ یہ امید نہ ہوتی تو وہ بچوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتی اور پھر خودکشی کر لیتی۔

اس گھر میں صبح سے شام تک برتن دھوتے، جھاڑو دیتے اور کھانا پکاتے اسے صبح سے رات ہو جاتی تھی۔ تھکن سے اس کا حوصلہ جواب دینے لگتا تھا مگر وہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ اسے ہر ماہ سو روپے ملتے تھے۔ اس کے رہنے کو جگہ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں تینوں وقت کھانے کو مل رہا تھا۔ تاہم اسی سرونٹ کوارٹر میں اس پر ایک اور سانحہ یہ گزرا کہ اس کی بیٹی جو لڑکے سے چھوٹی تھی ٹیٹنس میں مبتلا ہوئی اور مر گئی۔ اسے فوری طبی امداد مہیا ہو جاتی تو شاید وہ بچ جاتی۔ مگر نہ ٹیٹنس کا علاج آسان تھا اور نہ سستا۔

شاہینہ نے اسے بھی تقدیر کی آزمائش سمجھ کے قبول کیا اور اس امید کو ختم نہ ہونے دیا جو اس نے اپنے شوہر کی واپسی کے خیال سے وابستہ کر رکھی تھی۔ ہر روز ہر صبح، ہر شام وہ انتظار کرتی تھی کہ اس کی کوئی خبر ملے کوئی اس کا

پیغام لائے یا اچانک وہ خود آ جائے۔ امیدوں کے سراب کا یہ سفر ساتویں مہینے میں تمام ہوا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جیل سے فرار ہونے والا ڈاکو نادر شاہ اور اس کا ساتھی صداقت پولیس سے مقابلے میں مارے گئے۔

اس کے بعد شاہینہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے ایک ہی بار چیخ ماری۔ اپنا سر دیوار سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں ہوش کے مختصر وقفے آئے جب اس پر دیوانگی کا غلبہ تھا، ڈاکٹروں نے اسے پھر سلا دیا۔ اس کے لیے وقت کا احساس مٹ گیا، نہ جانے کتنا عرصہ وہ اسپتال میں پڑی رہی۔

پھر ایک دن اسے تھوڑی سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ جنرل وارڈ کے بجائے پرائیویٹ روم میں تھی۔ اس کا بیٹا شرافت صاف کپڑے پہنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ غور سے دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ یہ اسپتال بھی نہیں ہے، وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس گھر میں جہاں سے اس کو نکال کر سڑک پر ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے دوسرے کمروں میں جا کے دیکھا۔ ہر کمرا وہی تھا مگر اس کا اسباب نیا تھا۔

اس نے شرافت سے کہا۔ ”گڈو، ہم یہاں کب آئے؟“

شرافت نے کہا۔ ”کل۔ آپ کو نہیں معلوم؟“

شاہینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کون لایا ہمیں یہاں گڈو؟“

”ماں جی۔ وہ ہمارے ساتھ ہی آئے تھے۔“ شرافت نے کہا اور جیب میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ”یہ بھی دے گئے تھے وہ۔“

لفافے میں پانچ ہزار روپے تھے اور ایک بند لفافہ تھا۔ لفافے پر تحریر کو دیکھتے ہی شاہینہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آیا اور اسے یوں لگا جیسے زمین اس کے قدموں کے نیچے سے سرکتی جا رہی ہے، وہ بستر پر گر گئی۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھولا۔ یہ پروفیسر صداقت کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ زندہ ہے اور موت کی خبر جھوٹ تھی۔ بہت جلد وہ ملنے آئے گا۔

ایک بار پھر شاہینہ بے ہوش ہو گئی مگر اس بار خوشی سے، جب وہ ہوش میں آئی تو اس پر ہسٹریا کی دیوانگی کا ایک اور دورہ پڑا۔ وہ روتی رہی اور شرافت کو سینے سے لگا کے اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی ”مجھے معلوم تھا تم آؤ گے، مگر تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ تمھاری گڑیا تو انتظار کرتے کرتے روٹھ کر چلی گئی۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمھارے بغیر یہ دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ اتنی دیر سے کیوں آئے

ہو صداقت؟“

وہ ایک باہمت عورت تھی۔ شوہر کی زندگی کا یقین آتے ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اسے بالکل معلوم نہ ہو سکا کہ یہ گھر واپس دلوانے والا نادر شاہ ڈاکو تھا جس کی شاگردی پہ پروفیسر صداقت کو فخر تھا۔ اس نے وہ کیا تھا جو پروفیسر کے لائق و فائق شاگرد نہ کر سکے تھے، اس کے کئی ہاتھ تھے، یہ ہاتھ ہر جگہ پہنچ جاتے تھے کیوں کہ یہ ہاتھ بہت لمبے بھی تھے۔

شاہینہ نے پھر زندہ رہنے کے لیے کمر کس لی۔ اسے ہر ماہ پانچ ہزار روپے مل جاتے تھے مگر اسے یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ رقم لانے والا کون ہوتا تھا۔ اس نے کئی بار شرافت سے پوچھا کہ وہ ماماجی کون تھے اور کیسے تھے جو انھیں اسپتال سے لائے تھے مگر دس سال کا شرافت جو کچھ بتاتا تھا، وہ ناقابل فہم تھا۔ ظاہر ہے، وہ صداقت نہیں تھا پھر وہ کون تھا۔ کیا وہی ہر ماہ دروازے کے نیچے سے لفافہ اندر کھسکا جاتا تھا یا لیٹر بکس میں چھوڑ جاتا تھا۔ رقم کبھی منی آرڈر سے مل جاتی تھی تو کبھی بینک ڈرافٹ کے ذریعے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اب کوئی اس سے کچھ نہیں پوچھتا تھا۔ نہ پھر کبھی پولیس آئی تھی اور نہ اس نے خفیہ پولیس کے کسی آدمی کو گھر کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ محلے والوں نے رفتہ رفتہ اسے پھر قبول کر لیا تھا، صداقت کی بات پرانی ہو گئی تھی۔ شاہینہ نے اپنی آمدنی کو ”اپنے بھائی“ سے منسوب کر دیا تھا اور یہ کسی حد تک درست بھی تھا۔ ہر ماہ لفافے پر یہی لکھا ہوتا تھا۔ ”آپ کے بھائی کی طرف سے۔“

یہ بھائی ڈاکو نادر شاہ تھا۔ اس نے اپنے استاد کو جس چور دروازے سے نکالا تھا، اب اسی چور دروازے سے وہ پروفیسر کو آگے کا راستہ دکھا رہا تھا۔ اس نے پروفیسر کا نام بدلا۔ اس کے لیے نیا شناختی کارڈ حاصل کیا۔ پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس بنوایا۔ پروفیسر نے ڈکیتی کی وارادات میں اس کا ساتھ دیا لیکن دوسری طرف وہ ایک دیہی علاقے میں زمین خریدتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ ایک بہت بڑا زمیں دار بن گیا۔ اس کی زمینوں پر سیکڑوں کاشتکار کام کرنے لگے۔ اس علاقے کا جو زمیں دار اس کا حریف... ثابت ہو سکتا تھا، وہ ایک رات ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا خاندان وہاں سے نقل مکانی کر کے شہر چلا گیا۔ جاتے ہوئے انھیں اپنی سب زمین ایس وائی خان کو بیچنی پڑی۔ ایس وائی خان اس علاقے کا سب سے بڑا اور انتہائی غریب پرور زمیں دار تھا۔

سات سال بعد بالآخر شاہینہ کو اپنا گم شدہ شوہر مل گیا اس وقت جب وہ مایوس ہوچکی تھی اور یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ خط محض اس کی تسلی کے لیے تھا۔ صداقت اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ایک رات اچانک نادر شاہ ڈاکو ایک لمبی سی کار میں بیٹھ کے آیا۔ کار کے شیشوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے دستک دی اور سیدھا اندر چلا آیا۔ شاہینہ نے اپنے سامنے ایک چھ فٹ قد کے گھنی داڑھی اور خطرناک مونچھوں والے شخص کو دیکھا تو خوف سے اس کی آواز بند ہوگئی۔

"ڈرنے کی بات نہیں بہن۔ میں تم کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" اس نے شرافت کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔

یکلخت شاہینہ نے اسے پہچان لیا۔ "تم.... وہی ہو۔"

"ہاں بہن۔ میں ہی نادر شاہ ڈاکو ہوں۔ چلو۔"

"اب کہاں جانا ہے بھائی..؟"

"اپنے شوہر کے گھر اور کہاں۔ صداقت کے گھر۔ یہ سب ایسے ہی چھوڑ دو۔ اب یہ تمھارا گھر نہیں رہا۔"

اگلے سات سالوں میں نادر شاہ نے مسلسل پروفیسر صداقت کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کیا اور آگے بڑھنے میں اس کی بھرپور مدد کرتا رہا۔ ان کے درمیان اب اُستاد اور شاگرد کا نہیں جاگیردار اور ڈاکو کا رشتہ تھا۔ وہ اپنے اپنے نام بدل چکے تھے مگر وہ نظام نہیں بدلا تھا جس میں لوگ آج بھی ایک چہرے پر کئی چہرے سجا کے بے خوف پھرتے تھے۔

سیاسی جوڑ توڑ کا سارا کھیل پروفیسر صداقت نے پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ سرمائے سے مار کھا گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے چور دروازے سے میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو اس نے یہ بازی آسانی سے جیت لی۔ اس کا شاطر ذہن، ڈاکو نادر شاہ کی طاقت اور اس کا پیسہ مل کے وہ قوت بن گئے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے ایس وائی خان نے اپنا وہ حلقۂ اثر پیدا کر لیا کہ انتخابات کے بعد وہ ایک مضبوط حیثیت سے سامنے آیا۔

اب سابق پروفیسر صداقت یار خان کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایس وائی خان وزیر تعلیم تھا اور اس کا سالا نادر خان سنیئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس۔ یہ بھی کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ نادر خان پہلے ایک ڈاکو نادر شاہ ملنگی تھا جو چور دروازے سے سیاست میں آیا تھا۔ کیوں کہ سیاست میں آنے کے لیے اور کوئی دروازہ نہیں رہا تھا۔

اچانک ایس وائی خان کو احساس ہوا کہ صبح ہوگئی ہے وہ رات بھر ٹہلتے رہے تھے اور اپنے اس دوسرے ماضی کی یادوں میں سرگرداں رہے تھے جس کا ان کے اصل ماضی سے ہر رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ پروفیسر صداقت یار خان اور وزیر تعلیم ایس وائی خان کے درمیان ایک ایسی فصیل تھی جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ سوائے چور دروازے کے۔ جس میں سے کبھی کبھی وزیر تعلیم ایس وائی خان چپکے سے جا کے پروفیسر صداقت یار خان سے مل آتے تھے۔

اوپر شرافت کے کمرے میں ڈیک پوری آواز سے بج رہا تھا اور انگریزی گانوں کی کرخت چیخ و پکار یہ ظاہر کرتی تھی کہ ان کا ہونہار بیٹا جاگ اٹھا ہے۔ باہر ان کی سرکاری کار کو شوفر بڑی محنت سے چمکا رہا تھا اور ان کے گیٹ کے قریب لگا ہوا جھنڈا بڑی رعونت سے لہرا رہا تھا۔ اس جھنڈے کو دیکھ کر ایس وائی خان کا سر فخر اور غرور سے بلند ہوگیا۔ ان کی قوتِ فیصلہ لوٹ آئی۔

ٹیلی فون اٹھا کے انھوں نے اپنے آفس کا نمبر ملایا۔

"یس سر۔" ان کے پی اے نے کہا۔

"دیکھو۔ ایک پروفیسر ہے عبدالحق..؟"

"جی سر۔ وہی نا جس نے..؟"

"ہاں ہاں۔ اس کی معطلی کا کیس میرے آنے تک میز پر ہونا چاہیے۔" ایس وائی خان نے کہا۔

"یس سر۔"

"ایک بات اور۔ نادر خان صاحب کے پی اے کو فون کرو اور اس سے کہو کہ آج ہی سے اس پروفیسر عبدالحق کا مناسب بندوبست کرنے کے لیے کارروائی کا آغاز ہوجانا چاہیے۔"

"میں سمجھ گیا سر۔" پی اے نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد شرافت نے باہر جاتے جاتے انھیں دیکھا اور سیدھا ان کی طرف آیا۔

"ڈیڈ..." اس نے احتجاجی انداز میں بتانا شروع کیا۔

"کم آن سن۔ تمھارا داخلہ اسی کالج میں ہوگا۔" انھوں نے بیٹے کی بات مسکرا کر کاٹ دی۔ "آخر میں وزیر تعلیم ہوں۔"

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اس بے وقوف پروفیسر کو بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ چور دروازہ کہاں ہے جو کامیابی کی دنیا میں کھلتا ہے اور جب تک اس پر سارے دروازے بند نہیں ہوں گے وہ اس چور دروازے کو تلاش بھی نہیں کرے گا!"